Individualland

Creating space for the individual

فرد

شمارہ نمبر ۳ مئی ۲۰۱۲

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT

فرد

شمارہ نمبر ۳ مئی ۲۰۱۲

فہرست

ایڈیٹر کے ڈسک سے ______ ۰۳
بلوچستان میں داستان صحافت کی ______ ۰۴
کارکن صحافیوں کو درپیش چیلنجز اور مواقع ______ ۱۶
بلوچستان میں صحافت کو درپیش خطرات ______ ۱۸
لبرل نقطہ نظر ______ ۲۰
بلوچستان پرنٹ میڈیا کی نظر میں ______ ۲۲
۹ بجے: بلوچستان بلیٹن ______ ۲۴
بلوچستان خبروں میں کہیں نہیں ______ ۲۶
بلوچستان آن لائن ______ ۲۸
بلوچستان کے پریس کلبز کا ایک جائزہ ______ ۳۰
پول کے سوالات ______ ۳۲

ایڈیٹر:
حمزہ خان

پبلشر:
انڈویجوئل لینڈ پاکستان

کارٹونسٹ:
فاروق قیصر

کوارڈینٹر:
خرم سلیم، سید فہد الحسن

آئی ایس بی این ۷-۱۲-۹۵۸۲-۹۶۹-۹۷۸

Individualland
Creating space for the individual
مکان نمبر ۱۲۔ بی سٹریٹ نمبر ۲۶، ایف ۸/۱، اسلام آباد

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT

کے تعاون سے

ایڈیٹر کے ڈسک سے

معزز قائیرین،

یہ سال ۲۰۱۲ ہے، مئی کا مہینہ ہے، بہار ختم ہونے کو ہے اور ملک کے مختلف شہروں میں درجہ حرارت بڑھ رہا ہے۔ عوام بھی ۲۰۱۲-۲۰۱۳ کے بجٹ پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں اور اسی تناظر میں وزیر مالیات کے دفتر کا درجہ حرارت بھی بڑھتا دکھائی دے رہا ہے۔ سپریم کورٹ میں ۳۰ سیکنڈ والے واقعے کے بعد وزیر اعظم ہاوس میں ہوا کے دباو میں کمی نظر آتی ہے اور ایوان صدر بھی اپنی خلاء میں آکسیجن ماسک چڑھائے سانس لینے کی کوشش کر رہا ہے۔۔ اس ساری کشمکش کے درمیان ہم اپنے وعدے کے مطابق فرد میگزین کے اگلے شمارے کے ساتھ حاضر ہیں۔

اس شمارے پر کام کرنا پوری ٹیم کے لئے ایک چیلنج سے کم نا تھا۔ اس مضمون کے مرکزی خیال 'بلوچستان میں میڈیا کی حالت' کا مقصد صوبے میں ذرائع ابلاغ کے مختلف عناصر کا جائزہ لینا اور ان کے بارے میں سمجھ پیدا کرنا تھا۔ اس میں ریڈیو سے لے کر ٹی وی تک اور قومی سطح کے اردو اور انگریزی اخبارات سے لر کر آن لائن ویب سائٹس تک میڈیا کے مختلف عناصر کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ صوبے میں کام کرنے والے صحافیوں کو درپیش مسائل کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ آغاز میں ہم نے یہ جاننا ضروری سمجھا کہ آخر بلوچستان کی عوام میڈیا کے بارے میں کیا تاثر رکھتے ہیں؟ اور کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میڈیا ان کو درپیش مسائل کو ارباب اختیار تک پہنچانے کا فرض خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے؟

بہت سی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش میں اور مضامین کو بار بار پڑھنے سے بہت سے نئے مگر اہم سوالات کے جواب ملے ۔ ساتھیوں کے ساتھ بحث اور اختلاف رائے سے نا صرف بلوچستان کو درپیش مسائل کی سمجھ میں مزید اضافہ ہوا بلکہ صوبے کے حالات کی سنگینی کا بھی بخوبی اندازہ ہوا۔ لہذا جب تک ہم نے اس مضامین پر کام ختم نہیں کر لیا ہم چین سے نہیں بیٹھے۔

اس سعی میں ہمارے بلوچستان کے بہت سے نامور صحافیوں اور دیرینہ ساتھیوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ ان کے لکھے ہوئے مضامین آگے صفحات پر موجود ہیں۔ ان کی بیان کردہ حقیقت سے بلوچستان کے شہریوں کے مسائل کا ایک نیا رخ سامنے آیا۔ بلوچستان کے مسائل وقت کے ساتھ ساتھ مزید بدتری کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ عوام کو نا صرف امن و امان اور قانون بلکہ بہت سے معاشرتی مسائل کا بھی سامنہ ہے۔ وہاں کے مسائل اور دستیاب وسائل، دونوں اپنی بدتری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ بلوچستان کے صحافی نا صرف اپنی جان و مال بلکہ اپنے روزگار کے حوالے سے بھی پریشانی کا شکار ہیں۔ ان سب کے باوجود یہاں کے نڈر صحافی ایسے علاقوں میں بھی کام کرنے کو تیار ہیں جن کے شاید ناموں سے بھی ہم واقف نہیں ہیں۔

اس کوشش سے ہم ہرگز یہ تجویز نہیں کر رہے کہ میڈیا کو کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ یقیناً میڈیا یہ سمجھ ضرور رکھتا ہے۔ اس کوشش کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ میڈیا جو پہلے ہی باغیوں اور حساس اداروں کے درمیان پس رہا ہے، مزید بہت کچھ کر سکتا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ فرد کے اس شمارے کے بارے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز ضرور ارسال کریں گے۔

اگلے شمارے تک کیلئے اجازت

حمزہ خان

بلوچستان میں داستان صحافت کی

ارشاد مستوئی

بلوچستان میں صحافت آغاز وارتقاء

جس موجودہ عہد میں ہم سانس لے رہے ہیں اس کو ایج آف انفارمیشن کہا جاتا ہے جہاں انسانی تاریخ جدید تیز ترین میڈیا اور اس کے وسیع ترین ذرائع کو استعمال کر رہی ہے دنیا کے کسی بھی کونے کی خبر منٹوں اور چند سیکنڈوں میں دنیا کے منظر نامہ پر چھا جاتی ہے اور ساتھ ہی اس کے خلاف یا حق میں ردعمل بھی سامنے آجاتا ہے پرنٹ میڈیا آج آہستہ آہستہ ماضی کا قصہ بنتا جارہا ہے جبکہ اس کی جگہ سائبر، الیکٹرانک میڈیا نے لے لی ہے اس کے علاوہ سوشل نیٹ ورک کے عام استعمال کے بڑھتے ہوئے رجحانات نے بھی عالمی شعور اور رائے عامہ پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں موجودہ انٹرنیٹ کے دور میں جہاں بہت سی نئی جدید ٹیکنیک روشناس ہوئی ہے وہاں اسکے مثبت اور منفی استعمال اور اثرات کے علاوہ تعمیری اور مجرمانہ رجحانات اور رویے منظر عام پر آگئے ہیں۔ چیزیں اچھی یا بری نہیں ہوتیں بلکہ ان کا استعمال اچھا یا برا ہوتا ہے جس کا فیصلہ کسی بھی سماج میں رائج الوقت نظام اور اس کے قوانین کرتے ہیں۔

ہر ادارے کا کوئی نہ مقصد اور نظریہ لازمی ہوتا ہے جس کی وہ شعوری یا لاشعوری طور پر تکمیل کرتا ہے دور حاضر میں جہاں بہت سے دوسرے شعبوں میں جدت آئی ہے وہاں صحافت وصحافتی ادارے اور سوشل نیٹ ورک میں بہت ترقی ہوئی ہے لیکن ان سے منسلک بہت سے عام افراد اور ادارے اپنے سماجی کردار کا تعین کرنے سے قاصر ہیں۔ خاص طور پر سوشل نیٹ ورک کے کچھ نوجوان اپنی لاعلمی یا روایت پرستی میں اپنی ناسمجھی یا سمجھ بوجھ کے باوجود بھی پر پسماندگی اور ظلم کو رواج دے رہے ہیں۔ جبکہ آج عالمی سطح پر بہت سی عوامی اور انقلابی تحریکوں میں سوشل نیٹ ورک بہت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس وجہ سے میڈیا کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر اس کے فرائض اور اسکے کردار پر اکثر و بیشتر بحث اور تحریر وتقریر کی اشد ضرورت درکار ہے تاکہ عوام اور نوجوان اپنے اہم ترین طبقاتی سماجی کردار کا تعین کر کے معاشرے میں تعمیری اور انقلابی سوچ کو پروان چڑھا سکیں اور انسانی تاریخ میں شرمندہ ہونے کی بجائے سرخرو ہو سکیں۔ جس کے لئے انارکی اور رجعت پرستی کی پراگندگی سے اس سماج کو محفوظ بنانے کی ضرورت ہے کسی چیز کو کیسے استعمال میں لاتے ہیں یہ سماجی رویئے اور کردار کی شعوری کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ جبکہ سوشل نیٹ ورک جس پر ہر ایک کو آسانی سے دسترس حاصل ہے۔ اسے بلند شعوری اور سماجی تعمیر وترقی کے لئے بروئے کار لاتے ہوئے تمام دنیا میں پھیلے طبقاتی ظلم واستحصال کے خلاف ایک عوامی مزاحمتی تحریک کو جاری کرنے کی ضرورت ہے

آج تمام دنیا کی صحافت اور اس کے اداروں میں اور سیاسی افق پر جس لفظ کو بڑی بے پرائی سے سب سے زیادہ اور کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے وہ ہے،، غیر جانبداری،،۔ دنیا کے تمام ذرائع ابلاغ اسی غیر جانبداری کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے عوام کو بے وقوف بنا رہے ہیں جبکہ دنیا کے تمام ذرائع ابلاغ کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے بلوچستان میں صحافتی شعور نے اس کو مسترد کیا لفظ غیر جانبداری مکمل طور پر تمام حوالوں سے پسماندگی اور جہالت کا اعلیٰ تصور ہے۔ دنیا میں کوئی بھی چیز غیر جانبدار ہو ہی نہیں سکتی، نہ سیاست اور نہ ہی صحافت اور نہ ہی کوئی اور شعبہ زندگی۔ اور اگر ہو سکتی ہے تو پھر ہمیں سب سے پہلے دنیا میں موجود تمام تعصّبات اور نظریات کو مسترد کرنا ہوگا تمام مذاہب، قوموں، ملکوں، رنگ، نسل، طبقات، درجات، تفریقات اونچ نیچ، ذات پات، فرقات کو مکمل طور پر رد کرتے ہوئے ان تمام شاؤنزم کے انکار کے آغاز سے ہی غیر جانبداری کے تصور کا آغاز ہو سکتا ہے وگرنہ نہیں سماجی اور سائنسی طور پر آج کا عالمی طبقاتی معاشرہ خود غیر جانبداری کے نظریے کی مکمل نفی کرتا ہے۔ اور دوسری طرف یہی غیر جانبداری کا تصور ہی جانبداری کی منطق ہے۔ غیر جانبداری کا نظریہ اپنے پس پشت تعصّبات کا انکاری نہیں بلکہ تعبداری کی سوچ ہے یہ ظلم و جبر کے خلاف آواز نہیں بلکہ اس کی حمایت ہے اور اسکے بڑھتے تسلسل کو قائم رکھنے کا نظریہ ہے۔ بلوچستان میں صحافت کی تاریخ اتنی قدیم نہیں لیکن جب بلوچستان میں صحافت کی ابتداء ہوئی تو غیر جانبداری کی ذہنی غلاظت کے تعفن کو مسترد کرتے ہوئے ظلم جبر اور استحصال کے خلاف طبقاتی اور انقلابی تحریک کو منظّم کیا بلوچستان میں ماضی کا میڈیا عصر حاضر کے میڈیا کی طرح مالیاتی حکمرانوں اور ان کے ایجنٹوں کا نہیں تھا صحافت استحصالی حکمرانوں اور انکے ایجنٹوں کا ہتھیار نہیں بلکہ عوام اور خالص محنت کشوں کی طبقاتی لڑائی کا اوزار بنانے کی کوشش اور جدوجہد کی گئی بلوچستان میں اس کے آغاز کی کہانی اتنی پرانی نہیں بلوچستان میں صحافت کے کردار کو مایوس کن سمجھا جاتا ہے اور ایک تاثر یہ بھی ہے کہ بلوچستان میں صحافت قابل ذکر اور فیصلہ کن کردار ادا نہیں کر سکی بلکہ محض ''اشتہاراتی صحافت'' بن کر رہ گئی ۱۸۷۶ء میں جب انگریز نے بلوچستان میں اپنی قبضہ گیریت کے پنجے گاڑے تو اس کے تقریباً بارہ سال بعد ۱۸۸۸ء میں ماہنامہ ''بلوچستان ایڈوائزر'' کے نام سے پہلے اخبار کی اشاعت ہوئی گو کہ صحافت کسی بھی معاشرے کی عکاس ہوا کرتی ہے معاشرے میں موجود سیاسی، سماجی، معاشی، علمی، ادبی، ثقافتی رجحانات پروان چڑھانے میں اپنا اہم وکلیدی کردار ادا کرتی ہے لیکن ۱۸۸۸ء میں جب پہلا اخبار سامنے آیا تو اس میں بھی خبروں کی بجائے صرف اشتہارات کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا اس کے بعد بھی کئی ایک اشتہاراتی اخبارات کے اجراء کا تذکرہ ملتا ہے

۱۸۸۸ء میں پارسی مسٹر منچر جی کی ادارت میں ''بلوچستان گزیٹ'' کے نام سے

ہفتہ روزہ اخبار جاری کیا گیا انگریز دور میں دو خواتین مسز بریکٹ اور مسز نالی نے بھی اس ہفتہ روزہ اخبار کیلئے مدیرہ کے فرائض انجام دیئے مسٹر انسکمب بھی اس اخبار کے مدیر رہے انگریز دور کے بعد مسٹر فیروز منچر جی اس کے مدیر رہے اور ۱۹۳۵ء کے تباہ کن زلزلے تک اس میں ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے اس اخبار میں انگریز فوجی افسران کی تقرریوں اور تبادلوں کی خبروں کے ساتھ ساتھ اشتہارات بھی شائع ہوتے تھے

۲۳ اگست ۱۸۸۹ء میں ''بارڈر ویکلی نیوز'' کے نام سے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار جاری کیا گیا

ڈیلی بلوچستان گزٹ کے نام سے بلوچستان گزٹ ہفتہ وار کو ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہونے پر دوسرے ہی دن جاری کر دیا اور تھوڑے دن بعد جب جنگ شباب پر تھی اس کے دو ایڈیشن صبح اور شام شائع ہونے لگے اس میں جنگ کے متعلق تصاویر بھی شائع ہوا کرتی تھیں ۱۹۱۵ء میں امروہیہ کے خلیل الرحمن صدیقی نے اس کا انتظام سنبھالا۔ یہ پہلے مسلمان تھے جو یہاں کی صحافت میں آئے اس اخبار میں جنگ کے بارے میں خبریں اور پروپیگنڈا ہوا کرتا تھا۔

ڈیلی بلوچستان گزٹ کے چند دن بعد لڑائی کے حالات اور پروپیگنڈے کے لئے پہلا اردو روزنامہ ''راست گو'' کے نام سے جاری کیا گیا یہ ٹائپ میں چھپتا تھا اس کے لئے بمبئی سے رائٹر کی خبریں حاصل کی جاتی تھیں اور بمبئی سے بذریعہ ٹیلی گرام خبریں منگوانے کا انتظام تھا انگریزی حکومت کا یہ ترجمان ۱۹۱۸ء میں جب صلح ہوئی تو بند کر دیا گیا اور ڈیلی بلوچستان گزٹ کو سہ روزہ کر دیا گیا اور کچھ دن بعد پھر ہفتہ وار کر دیا گیا۔

بلوچستان میں بیسویں صدی کی چوتھائی تک کوئی لیتھو پریس قائم نہیں ہوا تھا اس لئے یہاں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں بھی نظر نہیں آتی تھیں اردو یہاں تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی کچھ ادبی ذوق اور شغف رکھنے والے لوگوں نے شعراء کے طرحی کلام اور کچھ ادبی علمی خبروں کی اشاعت کے لئے ۱۹۰۸ء میں ایک مختصر سا رسالہ ''قندیل خیال'' کے نام سے لورالائی سے جاری کیا اس رسالے کی تدوین و ترتیب کے علاوہ اردو کے فروغ کیلئے جو لوگ کام کر رہے تھے ان کے نام یہ ہیں سردار محمد یوسف خان، خان بہادر نبی بخش خان اسد، مولوی الہیٰ بخش وزیرزادہ عبدالاحد خان اور کرانی کے سید عابد شاہ ان کے علاوہ وقار انبالوی ایڈیٹر احسان بھی اردو کے فروغ اور قندیل خیال کی ترتیب و تدوین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے یہ بات قابل ذکر ہے کہ وقار صاحب نے اپنے تین تخلص یہاں اختیار کئے شاکر، ناظم اور غاصف مگر وقار سب پر غالب رہا قندیل خیال سال سوا سال شائع ہوتا رہا اور ۱۹۰۹ء میں بند ہو گیا۔

۱۹۱۸ء میں البرٹ پریس کے منتظمین نے البرٹ پریس سے ایک روزنامہ بلوچستان ہیرلڈ کے نام سے جاری کیا انگریزی میں چھپتا لیکن پنپ نہ سکا اور انہی دنوں بلوچستان گزٹ ہفتہ وار کر دیا گیا جو ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء تک جاری رہا اور پھر زلزلے کی نذر ہو گیا۔

بلوچستان ہیرلڈ کے کچھ دن بعد کرزن پریس کے مالکوں نے ایک ہفتہ وار اخبار انگریزی میں کوئٹہ نیوز کے نام سے جاری کیا مگر اس کا حشر بھی بلوچستان ہیرلڈ جیسا ہوا۔

۱۹۳۰ء میں ادبی، علمی، تعلیمی ماہنامہ ''نوشیروان'' کے نام سے اردو میں جاری ہوا اس کے ایڈیٹر صحرائی سروری تھے جن کا اصل نام بلدیو رائے سہائے تھا اس رسالے کی ترتیب و تدوین میں مسٹر مدحت زبیری اور الاس مرحوم کا بہت حصہ تھا یہ ماہنامہ ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کے زلزلے کے بعد بند ہو گیا اس رسالے کا ٹائٹل کا صفحہ نیلے رنگ میں چھپتا تھا اور اس پر اس کے نام کی مناسبت سے ترازو کی تصویر ہوا کرتی تھی۔

۱۹۳۵ء کے بعد اس خطہ میں صحافت پھلنا پھولنا شروع ہوئی عبدالصمد اچکزئی، نسیم تلوی، عین الدین، وقار انبالوی، محمد ارشد شاد، راشد امروہوی، مدحت زبیری، غلام محمد جمیل، عبدالحکیم سیماب نے قابل قدر خدمات انجام دیں اس سے قبل سرزمین بلوچستان میں انگریز سرکار نے تحریر و تقریر پر پابندی مسلط کر رکھی تھی اور صحافت سرکار کے زیر عتاب تھی اخبار کی اشاعت کی اجازت تھی اور نہ ہی کسی قسم کی سہولیات میسر تھیں انگریز سرکار کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی بھی اخبار کے اجراء کی جرائت نہیں کرتا تھا انگریز حاکم نے اس علاقے کو پسماندہ اور محکوم رکھنے اور اپنے اقتدار کو طوالت دینے کیلئے کالے قوانین کا سہارا لے رکھا تھا اقتصادی، معاشی اور تعلیمی پسماندگی شروع سے ہی بلوچستان کا مقدر رہی ہے اس وقت کے حاکمان کی بھی یہی خواہش تھی کہ بلوچستان تعلیم، تجارت، ثقافت، زراعت سمیت کسی بھی شعبہ میں ترقی کی منازل کا سفر طے نہ کرے بلکہ ہمیشہ انہی کا دست نگر بن کر رہے لیکن ظلم جبر اور استبداد کے خلاف آواز گونجی کچھ سرفروشان وطن نے پہاڑوں کا راستہ لیا اور ظالم سرکار کے خلاف اعلان بغاوت ہوا سرکار بہادر نے ان سرفروشان وطن کو باغی کا خطاب دیتے ہوئے اعلان کیا کہ ''اخبارات جیسی آزادی کا ہتھیار ان کے ہاتھ میں دینا کوئی عقل مندی نہیں'' نواب یوسف عزیز مگسی بلوچستان کی سیاسی علمی ادبی صحافتی تاریخ کا ایک اہم اور معتبر حوالہ ہیں جنہوں نے انگریز سرکار کے ظلم جبر استبداد کے خلاف آواز اٹھائی بلکہ بلوچستان میں جدید سیاست کی بنیاد رکھی انہوں نے ۱۹۲۹ء میں لاہور سے شائع ہونے والے اخبار ''ہمدرد'' میں ''فریاد بلوچستان'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں انگریز سرکار کے ظلم و جبر بربریت اور استبداد کا پردہ چاک کیا گیا یہ وہ دور تھا جب انگریز سرکار بہادر کے خلاف لب کشائی کرنا ایک جرم تصور کیا جاتا تھا مضمون لکھنے کی پاداش میں نواب یوسف عزیز مگسی کے خلاف مقدمہ چلایا گیا ۱۹۳۰ میں انگریز بہادر کے کاسہ لیس سرداروں نے جرگہ میں بیٹھ کر نواب یوسف عزیز مگسی کو ایک سال قید اور جرمانے کی سزا کا فیصلہ سنایا لیکن اس

فیصلے سے انہیں کے حوصلے پست نہ ہوئے بسروچشم سزا قبول کی اور دوران قید انہوں نے میر عبدالعزیز کرد کی جانب سے قائم کی جانے والی جماعت ''انجمن بلوچاں'' میں شمولیت اختیار کرلی انجمن بلوچاں کے پلیٹ فارم سے ہی ان کی عملی سیاست کا آغاز ہوتا ہے رہائی کے بعد نواب یوسف عزیز مگسی اس جماعت کے صدر منتخب ہوتے ہیں جس کو بلوچستان کی پہلی سیاسی جماعت کہا جاتا ہے ریاست قلات کے وزیراعظم شمس شاہ کے ظلم و جبر نے عوام کو ایک عذاب مسلسل میں مبتلا کر رکھا اور عوام ان کی استحصال پالیسیوں سے بیزار آچکے تھے شمس شاہ انگریز سرکار کے مفادات کے تحفظ کیلئے علیل والی ریاست خان محمد خان عالم کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے کو جانشیں مقرر کرنے کی خواہش رکھتے تھے جبکہ انجمن بلوچاں بلوچستان کے معاملات سے شمس شاہ کو دور رکھنے کی جہد مسلسل میں مصروف تھی اس حوالے سے ایک بھرپور و منظم تحریک چلانے کا فیصلہ کیا گیا اور ۱۹۳۱ء میں شمس شاہ کے مظالم پر مبنی ایک فہرست منظر عام پر لانے کے ساتھ ساتھ ''شمس گردی'' کے نام سے ایک پمفلٹ شائع کیا گیا جس میں بلوچستان کی تباہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے عوام کو اس ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے کی اپیل کی گئی اور اس تحریک کو منظم و فعال بنانے کیلئے شب و روز کوششیں کی گئیں اور کوششیں بار آور ثابت ہوئیں شہزادہ اعظم جان کو خان آف قلات کے منصب پر بٹھایا گیا نواب یوسف عزیز نے اپنی سیاسی جدوجہد کا سفر جاری رکھا اس دوران انہوں نے عوام میں سیاسی شعور اجاگر کرنے کیلئے قلم کا بھی خوب استعمال کیا لیکن زندگی نے ان سے زیادہ وفا نہ کی اور ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ میں آنے والے ہولناک زلزلے میں نواب یوسف عزیز مگسی بھی لقمہ اجل بن گئے بتایا جاتا ہے کہ ۱۹۳۷ء تک بلوچستان میں کسی قسم کا کوئی پریس ایکٹ لاگو نہیں تھا عبدالصمد خان اچکزئی نے جب اپنا اخبار ''استقلال'' بھی نکالنا چاہا تو انہیں ڈکلریشن کیلئے پنجاب سے رجوع کرنا پڑا اور انہی کی کاوشوں اور کوششوں سے بلوچستان میں پریس ایکٹ کا نفاذ ممکن ہوا ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک بلوچستان میں متعدد اخبارات شائع اور بند ہوئے ۱۹۳۶ء میں انگریزی زبان میں ''ایڈویٹائزر'' نامی اخبار شائع کیا گیا جو صرف اشتہارات پر مبنی ہوتا تھا جو دو سال کے بعد بند ہوگیا۔ اس کے بعد ''کوئٹہ ٹائمز'' کے نام سے ایک اور اخبار شائع ہوا جس کی ادارت بعد ازاں ''رستم جی'' نے لے لی جو بہت ہی قدیم انگریزی ہفت روزہ ہے جو ایک طویل عرصہ تک شائع ہوتا رہا ۱۹۳۸ کے اوائل میں ''استقلال'' نامی اخبار کا اجراء ہوا، عبدالصمد اچکزئی، قدوس صہبائی، اللہ بخش سلیم، شیر محمد خان، یعقوب غلزئی، اور محمد حسین وقتاً فوقتاً اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے ۱۹۳۹ء میں مولوی عبداللہ ''پاسبان'' کے نام سے ایک ہفت روزہ شائع کیا جس کو بعد ازاں پندرہ روزہ کیا گیا ۱۹۴۰ء میں مولانا عبدالجمیل کریم نے ''الاسلام'' کے نام سے ایک اخبار شائع کیا جس کی ادارت کے فرائض

بلوچستان کی اہم صحافتی شخصیات

یوں تو بلوچستان کے شعبہ صحافت میں کئی بڑے نام گذرے جنہوں نے علم و شعور کے انقلابی سفر کو جاری رکھا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن انہوں نے اپنے قلم کو زنگ آلود ہونے نہیں دیا ان میں سے چند حوالے اور چیدہ چیدہ نام ایسے ہیں جو منوں مٹی تلے دب جانے جانے کے باوجود تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

خان عبدالصمد خان اچکزئی

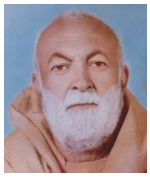

سابق افغان صوبہ قندھار میں شامل وادی پشین علاقہ عنایت اللہ ریز کے مقام پرے نومبر ۱۹۰۷ء کو خان عبدالصمد خان اچکزئی ایک علم دوطن دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نور محمد خان اچکزئی کا انتقال ہوا۔ ماموں محمد عثمان نے ان کی پرورش کا ذمہ لیکر ۱۹۱۹ء کو انہیں مقامی اسکول میں پڑھنے کے لئے داخل کیا۔ اسی دوران افغانستان کے حکمران امان اللہ خان نے آزادی کا اعلان کیا۔ انگریزوں نے افغانستان پر ۱۹۱۹ء میں تیسری جنگ مسلط کی۔ ایک معصوم طالب علم کی حیثیت سے عبدالصمد خان اچکزئی تعجب کی نگاہوں سے صورتحال دیکھتے رہے۔ ۱۹۲۹ء کو انگریزوں کی سازش سے افغانستان میں امان اللہ خان کو حکمرانی سے محروم کیا گیا۔ افغانستان کے عوام اور محکوم پشتون خوا کے لوگوں نے امان اللہ خان کو دوبارہ اقتدار پر بٹھانے کے لئے لشکر تیار کیا۔ خان عبدالصمد اچکزئی بھی چند ساتھیوں کے ساتھ اس قومی لشکر میں شامل ہونے کے لئے تیار ہوئے۔ انگریز حکام کو ان کے ارادے کی خبر ہوگئی تھی، اس ارادے سے باز رکھنے میں ناکام ہونے کے بعد انہیں گرفتار کیا گیا۔ یہ خان عبدالصمد خان اچکزئی کی پہلی گرفتاری تھی۔ انہیں سیاسی سرگرمیوں کے جرم میں گرفتار کر کے ریاستی جرگہ کے ذریعے جولائی ۱۹۳۱ کو دو سال قید بامشقت کی سزا دی اور پھر اس وقت انہیں رہا کیا گیا جب لندن میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کیلئے کانگریس نے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کی شرط پیش کی۔ رہائی کے فوراً بعد خان عبدالصمد خان لندن منعقد کانفرنس میں شرکت کرنے والے ہندوستان کے لیڈروں سے ملاقات کے لئے بمبئی گئے، جہاں گاندھی سے ملاقات کی۔ اسی موقع پر باچا خان سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی۔ ان کی یہ ملاقات طویل رفاقت کا سبب بنی۔ یہاں ہی بلوچ تحریک کے رہنما عزیز احمد کرد سے ان کی ملاقات ہوئی۔ دسمبر ۱۹۳۲ء میں بلوچ قوم پرستوں نے جیکب آباد میں ایک اور کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا جس میں خان عبدالصمد خان اچکزئی نے شرکت کی اور اس کانفرنس کی صدارت بھی خان عبدالصمد اچکزئی نے کی۔ دسمبر ۱۹۳۳ء کو حیدرآباد سندھ میں بلوچستان انفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس کا دوسرا سیشن کراچی کے خالق دینا ہال میں منعقد ہوا۔ خان عبدالصمد اس کانفرنس میں بھی شریک رہے۔ جنوری ۱۹۳۴ء کو کوئٹہ واپسی کے بعد وہ گرفتار ہوئے اور انہیں تین سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کے لئے برطانوی حکومت نے نیا قانون جاری کیا جس میں صوبوں کو محدود سطح پر خودمختاری اور سیاسی آزادی دی گئی اس قانون کا اطلاق بلوچستان میں بھی کیا گیا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خان عبدالصمد خان نے فوری طور پر کوئٹہ سے استقلال نامی

اخبار کی اشاعت کے لئے درخواست دی چند ماہ ان کی درخواست کو ملتوی رکھنے کے بعد انہیں اجازت دی گئی۔

انگریز حکومت نے انہیں بغاوت پھیلانے اور انتظامی امور میں خلل اندازی کے مرتکب ہونے پر رفقاء سمیت گرفتار کرلیا اس عرصے میں محمد اسلم خان اچکزئی نسیم تلوی محمد حسین نظامی اور محمد حسین عنقاء نے کراچی جا کر تحریر و تقریر اور صحافت کے ذریعے ان کی تحریک کو زندہ رکھا عبدالصمد اچکزئی کی گرفتاری پر مولانا ظفر علی خان نے اپنے اخبار زمیندار لاہور میں اداریئے لکھے اور ان کی گرفتاری کے واقعہ کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ ۱۹۳۵ء میں عبدالصمد اچکزئی رہا ہو کر کہ آئے تو اپنے پرانے رفیق کار یوسف مگسی کی یاد میں عزیز الیکٹرک پریس قائم کیا اسے بلوچستان کا پہلا لیتھو پرنٹنگ پریس کہا جاسکتا ہے اس دور میں بلوچستان میں کوئی پریس ایکٹ لاگو نہیں تھا عبدالصمد خان نے اپنا اخبار ''استقلال'' جاری کرنا چاہا تو انہیں اس کے لئے لاہور سے ڈیکلریشن حاصل کرنا پڑا اور ساتھ ساتھ بلوچستان میں پریس ایکٹ کے نفاذ کے لئے کوشش شروع کردیں جس وقت پریس ایکٹ کا نفاذ ہوا تو عبدالصمد خان اس وقت پابند سلاسل تھے جیل سے باہر آتے ہی سیاسی اور صحافتی سرگرمیوں کا آغاز بڑے زور و شور سے کیا اور باقاعدہ طور پر استقلال کا اجراء شروع کردیا یہ اردو زبان کا اخبار تھا جس کی تمام تر پالیسی کانگریسی نواز تھی یہ وہ دور تھا جب پورا ہندو پاک آزادی کے لئے جدوجہد کررہا تھا اس لئے بلوچستان بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہا کانگریس مقاصد کے حصول کے لئے بڑی تندہی سے کام کیا بعد میں استقلال کی ادارت تبدیل ہوتی رہی ۱۹۳۸ء میں عبدالصمد خان بلوچستان جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے پہلے صدر منتخب ہوئے اس کے علاوہ یونائیٹڈ پریس آف انڈیا کے نمائندے کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے قیام پاکستان کے بعد اخبار استقلال پر پابندی لگادی گئی اور پہلے مارشل لاء کے دور میں عبدالصمد خان اچکزئی ایک بار پھر گرفتار کرلئے گئے۔ عبدالصمد خان اچکزئی بنیادی طور پر ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے تسلیم کئے جاتے ہیں جبکہ صحافت کو اس مقصد کے حصول کے لئے استعمال کیا لیکن اس کے باوجود ان کی صحافتی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

جنوری ۱۹۳۸ء کو انہوں نے کوئٹہ سے پشتو اور اردو میں اخبار کی اشاعت شروع کی اور بلوچستان میں صحافت کے بانی ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ اسی سال خان شہید نے دیگر رفقاء کے ساتھ صلح مشورے کے بعد ۲۱ مئی کو ''انجمن وطن'' کے نام سے ایک سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھی، جس کی وجہ انگریزوں نے ۱۹۴۳ء میں خان عبدالصمد اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کیا۔ قیام پاکستان کے بعد بلوچستان میں برطانوی بیوروکریٹ اپنے عہدوں پر برقرار رہے۔ انہوں نے دوسرے دن ہی خان کو گرفتار کیا اور چھ سال خان عبدالصمد خان اچکزئی ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتتے رہے۔ آخرکار ۱۰ جنوری ۱۹۵۴ء کو حکومت نے انہیں رہا کردیا۔ ۲۵ اپریل ۱۹۵۴ء کو خان عبدالصمد خان کی سربراہی میں پشتون قوم پرستوں نے ورور پشتون کے نام سے ایک نئی سیاسی پارٹی بنائی اسی سال خان عبدالصمد خان ایک بار اس وقت گرفتار ہوئے جب حکمران بالادست بیوروکریسی نے بنگال کی اکثریت کو ختم اور مغربی پاکستان کے چار صوبوں پنجاب، پشتون خواہ بلوچستان اور سندھ کو ملا کر مغربی پاکستان کے نام سے نیا صوبہ بنایا اور باچا خان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب نے اس منصوبے کی حمایت کرتے ہوئے مغربی پاکستان کے وزیراعلیٰ بنے، جن کے عہدہ وزارت اعلیٰ میں پارلیمانی انتخابی مہم میں خان عبدالصمد خان اچکزئی کی یقینی کامیابی سے پاکستان کی بیوروکریسی اور ان کے کاسہ لیس سیاست دان بوکھلا کر ڈاکٹر خان کے حکم پر خان عبدالصمد خان کو ملک کی سلامتی کے خلاف سرگرمیوں اور لورالائی میں غیر ملکی جھنڈا لگانے کے جھوٹے الزام میں گرفتار کیا۔ عدالتی جنگ میں ڈاکٹر خان کی حکومت کو ناکامی کے بعد خان عبدالصمد خان اچکزئی کو رہا کیا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں پاکستانی بیوروکریسی قومی اور جمہوری تحریک کو روکنے میں ناکام ہونے کے بعد فوجی اداروں کو اپنے مذموم مقاصد میں استعمال کرنے کے لئے ایوب خان کی سربراہی میں ملکی اقتدار فوج کے حوالے کیا گیا اور ملک میں مارشل لاء لگا۔ فوجی حکومت نے خان عبدالصمد خان اچکزئی کو ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو گرفتار کیا۔ فوجی عدالت نے انہیں 14 سال قید کی سزا سنائی، اسی حکم نامے میں خان عبدالصمد اچکزئی سے کہا گیا کہ حکومت کی مخالفت ترک کرنے کی ضمانت دینے پر انہیں تین سال قید کی سزا کے بعد رہا کیا جائے گا مگر خان عبدالصمد نے یہ شرط ماننے نے انکار کیا۔ اپریل ۱۹۶۸ء میں ان کو فوجی عدالت کی جانب سے دی گئی مکمل سزا ختم ہونے کے بعد خان عبدالصمد خان اچکزئی کو رہا کیا گیا۔ کوئٹہ ایئرپورٹ پر ان کا فقید المثال استقبال ہونے سے حکمرانوں میں پیدا ہونے والے خوف کی وجہ سے ان کو دوبارہ گرفتار کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ہونے والے عام انتخابات میں خان عبدالصمد خان اچکزئی بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ یکم مئی ۱۹۷۲ء کو بلوچستان میں تاریخ میں پہلی صوبائی اسمبلی کا تاسیسی اجلاس خان عبدالصمد خان اچکزئی کی صدارت میں ہوا جس میں نومنتخب ممبران سے حلف اٹھانے کے بعد اسپیکر کا انتخاب عمل میں آیا۔ ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء میں بلوچستان کی سیاسی صورتحال بہت مخدوش تھی۔ خان عبدالصمد نے اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے بار بار پاکستان کے وزیراعظم سے ملاقاتیں کیں۔ آخرکار ان کی کوششوں سے ۶ دسمبر ۱۹۷۳ء کو بلوچستان کے مسئلہ سے تعلق رکھنے والی تمام پارٹیوں کا اجلاس اسلام آباد میں طلب کیا گیا مگر اس اجلاس کے انعقاد سے قبل ان کے گھر پر ۲ دسمبر ۱۹۷۳ء کو ہونے والے ایک حملے میں خان عبدالصمد خان جاں بحق ہوگئے

فضل احمد غازی:۔

فضل احمد غازی کا ہے جنہیں تحریک پاکستان میں ایک نڈر جوشیلے بے باک اور سرگرم کارکن کی حیثیت سے جانا اور پہچانا جاتا ہے فضل احمد نے قیام پاکستان سے قبل بلوچستان میں صحافت کے دوسرے دور میں اپنی بے مثل خدمات سرانجام دیں انہوں

نے مسلم لیگ کے ترجمان اخبار ''الاسلام'' کی ادارت کی اور کانگریس مخالفت کا جواب بڑے مفصل اور مدلل انداز سے دیا جس کی بناء پر اس اخبار نے مسلم رائے عامہ کو ہموار کرنے میں کرنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کریں اس کے علاوہ فضل احمد غازی نے خورشید کے نام سے بھی ایک اخبار جاری کیا یہ الاسلام جیسی شہرت تو حاصل نہ کرسکا لیکن پھر بھی اس کی مسلمہ حیثیت کو تسلیم کیا گیا تحریک پاکستان کے یہ اخبار قیام پاکستان کے بعد بھی شائع ہوتے رہے ان دونوں کے حوالے سے فضل احمد غازی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

میر عطاء محمد مرغزانی

میر عطاء محمد میر غزانی نے انتہائی نامساعد حالات میں صحافت میں قدم رکھا اور انگریزی استبداد کے خلاف آواز بلند کی سب سے پہلے ۱۹۳۵ ء میں ''الحق'' کے نام سے جریدے کا آغاز کیا انگریز سرکار نے ان کے اس اقدام کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے ۲۰۰۰ روپے کی ضمانت طلب کی جس کی وجہ سے اخبار بند ہوگیا اس کے بعد عطاء محمد نے کراچی سے ۱۹۴۷ ء میں ''پیغام'' اور ۱۹۴۸ ء میں ہفت روزہ ''کلمتہ الحق'' جاری کئے ان دونوں اخبارات میں انگریزوں کے غیر انسانی سلوک کا تذکرہ کھل کر کیا گیا ۱۹۵۰ ء میں ''کلمتہ الحق'' کو سبی سے جاری کیا اخبار کا مقصد لوگوں میں شعور و آگہی کو فروغ دینا تا ۱۹۵۲ ء سے پہلے ''بلوچستانی کے قلم سے'' کے عنوان سے لکھتے تھے بعد میں صرف مرغزانی لکھنا شروع کردیا ان کے جرائد سے جو نامور صحافی ادیب و دانشور وابستہ رہے ان میں ملک محمد رمضان کامل القادری، عبدالرحمان غور، عطاء اللہ بخاری، محمد عثمان، گل محمد اپروی اور مولوی عبدالباقی ذکر ہیں میر عطاء محمد آخری عمر میں انتہائی نامساعد حالات کا شکار رہے اور ان کے انتقال کے بعد عبدالرحمان غور نے ان کے مشن کو زندہ رکھنے کے لئے انتھک محنت کی مرغزانی نے اپنی قوم کے دکھ درد کو محسوس کیا اور ان کی زبوں حالی پر ہمیشہ رنجیدہ رہے ان کے اخبارات نے بلوچستان کے صحافت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں جسے صحافت کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

غلام محمد شاہوانی

بلوچستان کی صحافت کا ایک اہم اور معتبر حوالہ ہیں جنہوں نے ۱۹۴۹ ء میں شائع ہونے والے ''نوائے بلوچستان'' میں مدیر کے فرائض انجام دیئے اور ۱۹۵۳ ء میں انہوں نے ''نوائے وطن'' کے نام سے اپنا اردو ہفت روزہ اخبار نکالنا شروع کیا ایک ڈاکٹر کے خلاف لکھے گئے مراسلہ کی اشاعت اور ذریعہ اطلاع ظاہر نہ کرنے پر ان کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا اور انہیں اس مقدمہ میں سزا بھگتنا پڑی بعد ازاں نوائے وطن کی اشاعت کا سلسلہ رک گیا اور ان کے بعد ملک محمد پناہ نے ڈکلریشن لی اور انہوں نے بلوچی زبان میں ''نوائے وطن'' کی اشاعت کے سلسلہ کو آگے بڑھایا غلام محمد شاہوانی اس سے قبل روزنامہ اتحاد'' اور ہفتہ وار میزان میں بھی اپنے فرائض انجام دیتے رہے

میر عبدالرحمٰن کرد:۔ بلوچستان کی علمی ادبی، سیاسی اور صحافتی تاریخ کا ایک اہم حوالہ ہیں جنہوں نے ۱۹۵۷ ء میں پہلے مستونگ اور بعد ازاں کوئٹہ سے ہفت روزہ ''نوائے بولان'' کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جو ۱۹۶۱ ء میں بند ہوگیا

میر محمد حسین عنقاء

محمد حسین عنقاء نے ۱۹۶۲ ء سے قلم و قرطاس سنبھالا اور مسلسل ۴۵ سال عملی سیاست میں حصہ لیتے رہے حقوق کی جنگ میں جلاوطنی اور قید کی سزائیں کاٹیں بلوچستان میں انگریزی تسلط کے دور میں خان عبدالصمد خان اچکزئی، یوسف عزیز مگسی، میر عبدالعزیز اور اپنے بھائی محمد حسن نظامی کے ساتھ مل کر آزادی حریت جمہوری حقوق اور تحریک و تقریر کے پودے کی آبیاری خون جگر سے کرنے کا جتن کیا۔ ۱۹۳۲ ء میں اپنی ملازمت کی قربانی دے کر محمد حسین عنقاء نے کراچی سے پہلا اخبار ''البلوچ'' جاری کیا انگریزوں نے ناراض ہوکر ان کے بھائی حسین نظامی کو ملازمت سے برطرف اور محمد عثمان کی کوئلے کی کان ضبط کرلی لیکن اس کے باوجود آپ اپنے مشن پر ڈٹے رہے۔ بلوچستان میں انگریز سرکار کے مظالم کو اپنے اخبار میں مالات کی صورت میں لکھا کر قومی تحریک کو زندگی بخشتے رہے مجبوراً ''حکومت نے ان کے اخبار پر پابندی لگادی پھر ''بلوچستان جدید'' کے نام سے اخبار جاری کیا وہ بھی بند ہوگیا تو ینگ بلوچستان'' جاری کیا وہ بھی ضبط ہوا تو پھر ''نجات'' کا اجراء عمل میں لائے تنگ آ کر حکومت نے بلوچستان میں آپ کے اخبارات کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا ان حالات میں بھی عنقاء نے چوری چھپے اخبار کو بڑے بڑے لفافوں میں بند کرکے بلوچستان کے طول و عرض میں پہنچایا شروع کردیئے ساتھ ساتھ ہر شہر کے اخبارات میں بلوچستان کے اندر اور باہر ہر جگہ ہر دم جدوجہد میں مصروف رہے اخبارات و جرائد کی بندش اور قید و بند کی ایک طویل داستان ان سے منسوب ہے ان کی سیاسی اور صحافتی خدمات سے روگردانی ممکن نہیں قیام پاکستان کے بعد تادم مرگ صحافت سے منسلک رہے ادب میں بھی ان کا اپنا ایک مقام رہا اردو فارسی اور بلوچی کے فی البدیہ شاعر تھے۔

عبدالرحمان غور

عبدالرحمان غور نے جذبہ آزادی اور ملکی حالات سے متاثر ہوکر خاکسار تحریک میں شمولیت اختیار کی اور انگریز سرکار کے خلاف جدوجہد شروع کردی اس دوران انہیں گرفتاریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا ۱۹۴۵ ء میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ ملکر ''ادارہ ادب'' کے نام سے علمی ادارے کی بنیاد ڈالی جس نے نامساعد حالات کے باوجود ادب کی بہت زیادہ خدمت کی اس دور میں عبدالرحمان غور نے صحافت میں بھی قدم رکھا اور اس کی ابتداء ۱۹۵۰ ء میں سبی کے اخبار ''کلمتہ الحق'' سے کی اس کے ایڈیٹر عطاء محمد مرغزانی تھے اس

اخبار میں غور بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کرتے تھے اس کے بعد ۱۹۵۱ ء میں معلم کے لئے کام کرنا شروع کیا اور بعد میں اس کی ادارت سے منسلک ہوگئے اور ساتھ ساتھ ''تعمیر بلوچستان'' کے لئے بھی کام کرتے رہے پھر ''ایثار'' اور روزنامہ ''اتحاد'' کی ادارت میں شامل ہوگئے اتحاد کے بند وجانے کے بعد ''زمانہ'' اخبار میں بطور ایڈیٹر فرائض انجام دیتے رہے اور بعد میں اپنا ذاتی اخبار ''میثاق الحق'' جاری کیا لیکن دو سال کی مختصر مدت کے بعد یہ مالی مسائل اور پریس آرڈیننس کی عدم تکمیل کے باعث بند ہوگیا اس کے بعد عبدالصمد ذاکر بٹالوی کے ''اخبار صبح'' میں نوکری اختیار کرلی بلوچی اکیڈمی کے زیر آسام کئی کتب کی اشاعت ہوئی کافی عرصے بیمار رہے اور ٹی بی کے عارضے سے انتقال ہوا۔

کمال الدین

بلوچستان کی صحافت میں مرحوم کمال الدین کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی کتاب ''صحافت وادی بولان میں'' جس میں بلوچستان کے صحافتی ارتقاء سے لیکر ۱۹۶۴ ء تک کا احوال بڑی تفصیل سے تحریر کیا گیا ہے ان کی یہ کتاب ان کی وفات کے کافی عرصے بعد بلوچی اکیڈمی نے ۱۹۷۸ ء میں شائع کی کمال الدین نے باقاعدہ صحافت کا آغاز ۱۹۴۸ ء میں ہفتہ وا اخبار ''میزان'' سے کیا اور اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اسی دوران ''سندھ ابزرور'' کے کوئٹہ میں رپورٹر بھی رہے ۱۹۵۲ ء میں اپنا اخبار ''بچوں کا شاہین جاری کیا اور میزان سے مستعفی ہوکر روزنامہ اتحاد کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا پھر بچوں کا شاہین اور اتحاد کو چھوڑ کر مستونگ کے ہفتہ وار اخبار ''یونین'' کے چند پرچوں کی ادارت سنبھالی جب کوئٹہ سے جنگ کا آغاز ہوا تو وہ قومی اخبار کے اسٹاف رپورٹر متعین ہوئے۔

بابو عبدالکریم شورش

بابو عبدالکریم شورش بلوچستان کے بلند پایہ صحافی تھے اور بلوچستان کی صحافت میں ترقی پسندانہ رویوں کو فروغ دینے میں ان کا نمایاں کردار ہے ب ابو نے ایسے وقت میدان صحافت کا رخ کیا جب علاقے میں سردارانہ نظام کا دور دورہ تھا قلم اور زبان دونوں پر پابندی لگی ہوئی تھی ان تمام بندشوں کے باوجود بابو نے اپنا مشن جاری رکھا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں ریاست بدری کے بعد کوئٹہ تشریف لائے تو عبدالصمد خان اچکزئی کے ساتھ ہفت روزہ ''استقلال'' میں کام کرنے لگے اور یہیں سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا ۱۹۵۳ ء میں جب لالہ غلام محمد شاہوانی نے ہفت روزہ ''نوائے وطن'' کا آغاز کیا تو اس میں بھی لکھنا شروع کیا اور اپنے ولولہ انگیز مضامین کے ذریعے ایک عرصے تک اہلیان بلوچستان کے دلوں کو گرماتے رہے اکتوبر ۱۹۵۷ ء میں عبدالرحمان کرد کے جاری کردہ ہفتہ روزہ اخبار سے منسلک ہوگئے اور پھر ''میثاق الحق'' میں کام شروع کردیا اور اپنی زندہ جاوید تحریروں کے ذریعے عوام کو ایک جدید انداز فکر عطاء کیا ہفت روزہ زمانہ جو آج کل روزنامہ اخبار ہے آپ ہی کی انتھک محنت اور کوششوں کا نتیجہ ہے رپوتاژ اور علاقائی غور و معاملات پر آپ کے شذرات نے بھی حشر اٹھایا ۱۹۶۴ ء میں بابو عبدالکریم شورش نے ''نوکین دور'' جیسے نڈر بے باک اور دلیر اخبار کا اجراء کر کے بلوچی اردو صحافت میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیا اس کے معیاری پن اور ہر دلعزیزی بابو عبدالکریم شورش کی دن رات محنت کا ثمر تھی اس جریدے نے وقتاً فوقتاً بڑے خوبصورت اور ضمیمہ خصوصی نمبر بھی شائع کئے نوکین دور کے لئے مالی وسائل بابو کو بہت زیادہ تگ و دو کرنا پڑتی تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ بابو عبدالکریم نے اس کی آبیاری اپنا خون سینچ کر اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا یہ چونکہ حکومت مخالف اخبار تھا اس لئے بیشتر اوقات اسے سرکاری اشتہارات سے بھی محروم رکھا گیا مالی وسائل کی بنیاء پر نوکین دور بند ہوگیا اور بابو عبدالکریم شورش نے کارڈ چھاپ کر بانٹنا شروع کردیئے جنہوں نے کسی حد تک نوکین دور کے خلاء کو پر کردیا۔ بابو شورش کو منافقت کی سیاست اور صحافت سے شدید نفرت تھی اپنی ذات میں ایک دیانتدار راست باز اور صداقت پسند اور مخلص نظریاتی انسان تھے تادم مرگ اعصائے قلم سے جنگ لڑتے رہے۔

ملک محمد پناہ

بلوچستان کے شعبہ صحافت علم و ادب کا ایک بہت بڑا اور معتبر حوالہ ہیں جنہوں نے زمانہ طالب علمی سے لکھنے کا آغاز کیا ملک محمد پناہ بلوچستان میں ایک بے باک صحافی نقاد اور دانشور کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں میر گل خان نصیر اور ان جیسے دوسرے ممتاز اہل قلم کی صحبت انہیں حاصل رہی اس لئے اردو زبان و ادب سے محبت ہوگئی ایسی شائستہ صاف ستھری اور نکھری ہوئی اردو بولتے اور لکھتے تھے کہ اہل زبان بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے ملک محمد پناہ کے دور میں بلوچستان استحصالی نظام میں جکڑا ہوا تھا اور بے انتہاء مسائل کا شکار تھا ملک محمد پناہ نے غریب عوام کے دکھ درد اور حالت زار کو دیکھا اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی ٹھان لی اور سب سے پہلے کراچی کے دو اخبارات ''بولان'' اور ینگ بلوچ'' اور ''بلوچی'' میں ظالمانہ نظام کے خلاف لکھنا شروع کیا تاکہ عوامی شعور بیدار ہوسکے نیشنل قلات پارٹی میں شمولیت اور جاگیردارانہ اور سرداری نظام کے خلاف سیاسی جدوجہد پر انہیں ریاست بدر کردیا گیا ملک محمد پناہ نے اپنی جلاوطنی کے ساتھ جیکب آباد کو رخت سفر باندھا لیکن انہوں نے سیاسی شعور کے سفر کو جمود کا شکار ہونے نہیں دیا جیکب آباد پہنچنے کے بعد انہوں نے ممتاز سیاسی رہنماء اسلم خان اچکزئی کے ہفت روزہ اخبار ''نوجوان'' سے وابستگی اختیار کرلی اور اس میں مستقل لکھتے رہے لیکن مٹی سے جڑی بے چینی نے انہیں یہاں کچھ زیادہ عرصہ قیام کرنے نہیں دیا اور وہ واپس سبی گئے اور پھر سبی سے مچھ بولان میں انہوں نے کوئلہ کی کان میں بطور منشی ملازمت اختیار کرلی۔ خان آف قلات انگریزی جاننے لکھنے پڑھنے کی وجہ سے ملک محمد پناہ کو بڑی عزت دیتے تھے۔ انہوں نے ملک محمد پناہ کو

واپس اپنے پاس بلالیا اور انہیں دوبارہ ملازمت دی لیکن ملک محمد پناہ عوام میں انقلابی شعور اجاگر کرنے کیلئے ہمیشہ سرگرم رہے اور انہوں نے ملازمت کو خیر باد کہہ دیا اور لکھنے کا سلسلہ ٹوٹنے اور رکنے نہیں دیا کچھ عرصہ تک انہوں نے محمد حسین عنقا کے اخبار میں بھی کام کیا اور پھر عبدالکریم شورش کے اخبار نوکین دور میں ''دروغ دروغ راست راست'' کے عنوان سے ایک طویل عرصہ تک کالم نویسی کرتے رہے۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے غلام محمد شاہوانی کے اخبار ''نوائے وطن'' کا ڈکلریشن دوبارہ حاصل کیا اور ۸۰ء تک اس کی باقاعدہ اشاعت کرتے رہے جس کی اشاعت انتہائی نزاع اور کسمپرسی کی حالت میں بھی جاری رکھی ان کی وفات کے بعد ان کی صاحبزادی آمنہ پناہ نے اپنے والد کے مشن کو جاری رکھنے کے عزم کا اعادہ کیا اور ان کی وفات کے ایک سال بعد انہوں ڈکلریشن اپنے نام لیا جو آج بھی ''نوائے وطن'' کو شائع کر رہی ہیں آمنہ پناہ موجودہ دور کے منافقانہ رویوں سے انتہائی مایوس نظر آتی ہیں اپنے والد کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ان کے والد بلوچی اکیڈمی کے وائس چیئرمین ہوتے ہوئے بھی نوائے وطن کے تمام امور خود ہی سرانجام دیتے رہے اور تادم مرگ اسی سے منسلک رہے ملک پناہ نے ''نوائے وطن'' کے ذریعے بلوچستان کی نئی نسل کی سیاسی تربیت اور درست سمت میں رہنمائی کی اور سرداری نظام کے خلاف قلمی جہاد کیا کبھی بھی اپنے اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔

ملک محمد رمضان:۔

ملک محمد رمضان بلوچستان کی صحافت کا ایک اہم معتبر اور نا قابل فراموش حوالہ ہیں جنہوں نے ۱۹۵۳ء میں سبی سے حسن نظامی کے شائع ہونے والے اخبار کلمتہ الحق سے اپنے صحافتی سفر کا آغاز کیا انہوں نے اپنے صحافتی سفر کے دوران کئی نشیب و فراز دیکھے بلوچستان کے بلوچوں کے ڈومکی قبیلے سے تعلق رکھنے والے ملک محمد رمضان نے ریاست قلات کے قریب مستونگ میں پڑاؤ کیا اور وہاں سے انہوں نے ۱۹۶۰ء دہائی میں ''ساربان'' کے نام سے یک ہفت روزہ جاری کیا جو ۱۹۶۰ تک جاری رہا ساربان اردو اور بلوچی زبان میں شائع ہونے والا ہفت روزہ تھا ۱۹۸۵ء میں ملک محمد رمضان بلوچی زبان و ادب کی ترقی و ترویج کیلئے قائم کئے جانے والے ادارے بلوچی اکیڈمی کے چیئرمین منتخب ہوئے ۱۹۸۶ء میں پریس کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا تو ملک محمد رمضان اس ادارے کے بانی عہدیداروں میں شامل رہے انہوں نے علم و ادب اور صحافت کے فروغ میں نا قابل فراموش کردار ادا کیا۔

نور محمد پروانہ

نور محمد پروانہ کا سب سے بڑا کارنامہ براہوی زبان کے مستند اخبار ہفت روزہ ''ایلم'' کی اشاعت ہے۔1960ء کی دہائی میں ہفتہ روز ایلم نے براہوی زبان وادب کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا آج اکثر اہل قلم اور صاحب تصنیف حضرات ایلم مستونگ ہی کے مرہون منت ہیں بلوچستان میں براہوی زبان کا واحد اخبار ہے جو کثیر تعداد میں باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے براہوی رسم الخط اور املا کو صحیح سمت دینے میں اس ہفت روزے کا بہت بڑا ہاتھ ہے نور محمد پروانہ کو بچپن ہی سے اپنی زبان ادب اور ثقافت سے دلچسپی تھی اس سلسلے میں چھوٹی موٹی تنظیمیں بھی بناتے رہے اپنی زبان کو سرکاری سطح پر متعارف کروانے کے لئے بھی تگ و دو کرتے رہے نور محمد پروانہ نثر میں کمال مہارت دکھانے کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً غضب کی نظم بھی کہا کرتے تھے ۱۹۹۰ء میں دے ٹک (سہ ماہی) نے نور محمد پروانہ کی شخصیت اور صحافتی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے مضامین اور طویل انٹرویوز پر مبنی خاص نمبر کی اشاعت کی اور انہیں ''بابائے براہوی صحافت'' کا خطاب دیا گیا نصف صدی سے زائد صحافتی میدان میں ثاقب قدمی سے اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے لیکن انہیں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ حقدار تھے۔

بلوچستان کے صحافیوں کی آراء

کوئٹہ اور حب سے شائع ہونے والے قومی اخبار روزنامہ ''انتخاب'' کے ایڈیٹر انور ساجدی بتاتے ہیں کہ ستر کی دہائی یا اس سے قبل صحافت محدود تھی اور اس پر بھی پابندیاں عائد تھیں بلوچستان میں انگریز دور میں اخبارات کے اجراء پر پابندی عائد تھی لیکن اس کے باوجود لوگوں نے کراچی اور جیکب آباد جیسے علاقوں سے بیٹھ کر اخبارات شائع کئے ''البلوچ'' اور ''حنیف'' قابل ذکر ہیں جو نسیم تلوی شائع کرتے تھے کوئٹہ سے پھر استقلال کا سفر شروع ہوا لیکن صحافت میں تبدیلی آئی وہ ۱۹۷۲ء میں کوئٹہ سے روزنامہ جنگ کی اشاعت کے بعد آئی جس میں نے بطور رپورٹر کام کیا اس سے قبل میں خضدار سے بطور نامہ نگار جنگ گروپ کے ساتھ منسلک تھا۔ اس سے قبل بلوچستان سے شائع ہونے والے اخبارات کسی نہ کسی تنظیم یا نظریاتی سوچ و فکر کے ساتھ وابستہ تھے اور محدود تھے لیکن جنگ نے یہاں اس حصار کو توڑتے ہوئے ایک مارکیٹ میکنزم بنایا لیکن وہ بھی مکمل نہیں تھا جنگ کی جانب سے متعارف کرائے گئے مارکیٹ میکنزم کو ذہن میں رکھتے ہوئے ۱۹۸۷ء میں یہ خیال آیا کہ بلوچ علاقوں میں ایک ایسا قومی اخبار نکالا جائے جس میں بلوچستان اور بلوچستان کے عوام اور یہاں کی قومی سیاسی جماعتوں کو ایک سپیس فراہم کیا جاسکے جو انہیں ملک کے دیگر اخبارات میں نہیں ملتا تو ہم نے ''انتخاب'' کا ڈکلریشن لیا ایک سال بعد اس پر سرکار نے پابندی عائد کردی پھر ۱۹۸۹ء میں ہم نے ایک بار پھر اپنے سفر کا آغاز کیا ابتدائی طور پر ہم نے حب سے سفر شروع کیا پھر ہم نے سوچا کہ اب کوئٹہ سے اس سفر کو مزید آگے بڑھایا جائے اور پشتون علاقوں تک پہنچا جائے۔ ۱۹۹۴ء میں ہم نے ''انتخاب'' کوئٹہ کا ڈکلریشن حاصل کیا لیکن اس کی اشاعت ممکن نہ ہوسکی ۲۰۰۳ء میں باقاعدہ طور پر ہم نے کوئٹہ سے اپنے سفر کا آغاز کیا اس دوران دور جدید کی صحافت میں بلوچ قومی تاریخ تہذیب ثقافت، ادب، سیاست کو کچھ اس طرح

ازسرنو متعارف کرایا کہ جنگ سمیت یہاں سے شائع ہونے والے اخبارات کی مجبوری بن گئی کہ وہ بلوچستان کیلئے ایک ''اسپیس'' مختص کریں ان کے مطابق ۱۹۸۸ ء تک ملک میں پریس آرڈیننس ہی نہیں رجسٹریشن آف پریس اینڈ پرنٹنگ آرڈیننس کو نافذ العمل کیا گیا اور بعدازاں اظہار رائے کی آزادی کے ساتھ ساتھ خود احتسابی کیلئے پریس کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا لیکن بدقسمتی سے پریس کونسل اپنے قیام سے لے کر آج تک غیر فعال رہا اس کی غیر فعالیت کی وجہ سے خود احتسابی کے عمل کو پروان چڑھایا جاسکے اور نہ ہی صحافتی اقدار کو پامال ہونے سے بچایا جاسکے جس کی وجہ سے عصر حاضر میں صحافت کا کردار سماج میں تبدیلی لانے والا نظر نہیں آتا گو کہ میڈیا کی دنیا میں انقلاب برپا ہوا ہے لیکن یہ انقلاب بے نتیجہ ہے جہاں تک حکومتی دباؤ کی بات ہے تو یہ نئی بات نہیں پہلے زمانے میں بھی سرکار کی مداخلت اور دباؤ کا سامنا رہا ہے بلکہ سب کچھ کنٹرول ہوتا تھا اظہار رائے کی ایسی آزادی میسر نہیں تھی لیکن حالات مختلف اور پہلے سے کہیں زیادہ خراب اور بدتر ہوگئے ہیں گو کہ بلوچستان روز اول سے ہی ''وار اور کنفلکٹ زون'' ہے جہاں صحافت صرف دنیا کو آگاہی دینے یا باخبر رکھنے کا نام نہیں بلکہ متاع حیات کو ہتھیلی پر رکھنے کا نام ہے حالانکہ بین الاقوامی سطح پر ''وار'' زون میں فرائض انجام دینے والے صحافیوں کو تحفظ کی ضمانت ہوتی ہے بلکہ انکی انشورنس بھی ہوتی ہے لیکن بلوچستان میں متاع حیات کو ہتھیلی پر لے کر دنیا کو باخبر رکھنے کا فریضہ انجام دینے والوں کو اس طرح کی کوئی ضمانت فراہم نہیں کی گئی کب کہاں سے گولی چلے، بم پھٹے، کچھ علم نہیں عدم تحفظ کا احساس دن بہ دن بڑھتا جارہا ہے سرکاری اداروں، مسلح تنظیموں، سیکورٹی فورسز، اور سیاسی جماعتوں کی جانب سے صحافیوں پر جس طرح طرح دباؤ بڑھ رہا اور بلوچستان کے مخصوص حالات میں صحافی اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ غیر معمولی حالات میں دلیری، بہادری سے فرائض انجام دے رہے ہیں یا پھر یہ ان کا جنون اور پاگل پن ہے بلوچستان میں مسلح گروہوں اور سرکاری اداروں نے اپنی جنگ میں صحافیوں کو شامل کرلیا ہے جو درست نہیں صحافیوں کو اس جنگ میں شامل نہ کیا جائے بلکہ صحافی برادری کے تحفظ اور اظہار رائے کی آزادی کی راہ ہموار کرنے کو یقینی بنانے کیلئے اپنا مؤثر و عملی کردار ادا کریں بدقسمتی سے ہمارے ملک میں جمہوریت کو پنپنے نہیں دیا گیا کبھی جمہوری اداروں کو پروان نہیں چڑھایا گیا یہی وجہ ہے کہ آج یہاں میڈیا سے وابستہ افراد بھی خود کو غیر محفوظ تصور کررہے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کے اظہار آزادی کے حق پر پابندیاں عائد کی جارہی ہیں پورے ملک میں حالات انتہائی تشویشناک ہونگے تاہم اس کی نسبت بلوچستان میں صحافیوں کی مشکلات کچھ زیادہ ہیں ہمیں اس کا بخوبی ادراک اور احساس ہے کہ بلوچستان کے صحافی انتہائی نا مساعد حالات میں اپنی صحافتی ذمہ داریاں غیر جانبداری اور ایمانداری سے نبھا رہے ہیں۔ بلوچستان کے صحافی نہ صرف عدم تحفظ کا شکار ہیں بلکہ سرکاری اداروں اور مسلح جدوجہد کرنے والے گروہوں کی جانب سے ان پر دباؤ ڈالا جاتا ہے جو کہ غلط ہے اور ہم ان سے بھی ہمیشہ یہ اپیل کرتے رہتے ہیں گے کہ وہ صحافی برادری کو خوف میں مبتلا کرنے کی بجائے اظہار رائے کی راہ کو ہموار کرنے کو یقینی بنائیں، انہوں نے بلوچستان میں صحافیوں کو درپیش مشکلات اور حکومتی سطح پر کسی قسم کے اقدامات نہ کرنے پر تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ آزادی صحافت کو تحفظ فراہم کئے بغیر ملکی سلامتی جمہوری استحکام ممکن نہیں بلوچستان کی صورتحال انتہائی گھمبیر و مشکل ہے یہاں صحافیوں کو ہر طرف سے دباؤ کا سامنا ہے۔

بھٹو دور میں صحافتی زندگی کا سفر کرنے والے بزرگ صحافی رشید بیگ بتاتے ہیں کہ ماضی میں صحافیوں کے لئے حالات مشکل ضرور تھے لیکن جس طرح کے دباؤ کا سامنا آج بلوچستان کے صحافیوں کو کرنا پڑ رہا ہے صورتحال ایسی قطعاً نہیں تھی آج حالات انتہائی سنگین ہیں بیرون بلوچستان سے شائع ہونے والے قومی اردو اخبارات میں ہفت روزہ ڈائری اور مضامین لکھنے سے میدان صحافت میں آنے والے رشید بیگ بعدازاں بلوچستان کے علاقے حب سے شائع ہونے والے اخبار انتخابات کے ساتھ وابستہ ہوگئے اور تاحال اس کے ساتھ منسلک ہیں کوئٹہ پریس کلب کے قیام، بلوچستان یونین آف جرنلسٹس کی فعالیت کے حوالے سے رشید بیگ کا کردار ناقابل فراموش ہے اس سے قبل ۱۹۸۴ ء میں کوئٹہ پریس کلب میں صحافتی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر تھیں بلکہ کوئٹہ کے شہری بھی کوئٹہ پریس کلب کے وجود سے لاعلم تھے ان کے مطابق عبدالکریم بٹ نامی صحافی نے خود کو تاحیات صدر بنا رکھا تھا جس کو چاہتے رکن بناتے صحافیوں پر پریس کلب کے دروازے بند تھے شخصی اقتدار تھا جب پریس کلب کی عمارت میں ایک صحافی کو باقاعدہ رہائش دینے کا فیصلہ کیا گیا تو اس کے خلاف تحریک شروع کی گئی اور عدلیہ سے رجوع کیا گیا ڈیڑھ سال کی انتھک جدوجہد کے بعد پریس کلب آزاد ہوا، اور جنوری ۱۹۸۹ ء میں آزادانہ عام انتخابات ہوئے رشید بیگ کے مطابق آج بلوچستان میں نظریاتی صحافت کا فقدان بھی ہے اور صحافیوں کے لئے حالات انتہائی سنگین بھی ہیں صحافی عدم تحفظ کا شکار ہوکر رہ گئے ہیں

جامعہ بلوچستان میں شعبہ ابلاغیات کے پروفیسر بیرم غوری کہتے ہیں کہ میڈیا کے کردار کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا آج تیز رفتار ترقی کا دور ہے جہاں سوشل میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے زمانی کی اہمیت اور بڑھا دی اب اخبارات پر وہ انحصار نہیں جو اس سے قبل تھا اخبارات کی بھی اگر بات کی جائے تو بلوچستان کے دور دراز اضلاع میں سے چند ایک ہونگے جہاں اخبار پہنچتا ہے باقی پورے بلوچستان میں شاید اخبار بھی نہیں پہنچتا ان کے مطابق میڈیا نے جس طرح ترقی کی منازل طے کی ہیں اس سے نظریاتی صحافت بھی ختم ہوگئی ہے ۷۲ ء میں صحافت نظریاتی تھی لیکن آج مالیاتی ادارے کسی اور دائرہ اثر میں رہتے ہوئے سفر کو آگے بڑھا رہے ہیں بلوچستان میں صحافت کی ترقی اور صحافیوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کیلئے ٹھوس بنیادوں پر عملی اقدامات نہیں کئے گئے جس کی سخت ضرورت ہے بلوچستان کے مخصوص سیاسی حالات کے پیش نظر یہاں پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھانے والے صحافیوں کو تحفظ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ بلوچی، براہوی، پشتو سمیت دیگر زبانوں کی صحافت کو زیادہ ترجیح اور ترقی دینے کی ضرورت ہے

بلوچستان یونین آف جرنلسٹس کے صدر محمد عیسیٰ ترین صحافیوں اور اس صنعت سے وابستہ کارکنوں کو مسلح گروہوں اور سرکاری اداروں کی جانب سے ہراساں کرنے، صحافیوں کے قتل عام اور صحافیوں کو تحفظ کی عدم فراہمی پر حکومت کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ملک اور بالخصوص بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں صحافیوں کے لیے حالات روز بروز مشکل ہوتے جا رہے ہیں گذشتہ چند سال کے دوران ملک بھر میں ۶۲ جب کہ خیبر پختونخوا میں ۲۲ صحافیوں اور بلوچستان میں ۱۳ صحافیوں کو قتل کیا گیا ہے جس کے خلاف صحافی احتجاج کرتے کرتے تھک گئے ہیں لیکن حکمرانوں اور انصاف کے اداروں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ صحافیوں کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے کسی بھی قسم کا تحقیقاتی کمیشن تشکیل دیا گیا اور نہ ہی صحافیوں کے قاتلوں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے کسی قسم کے اقدامات اٹھائے گئے۔ کہنے کو تو صحافت کو ریاست کا چوتھا ستون قرار دیا جاتا ہے لیکن صحافت سے وابستہ افراد انتہائی نامساعد حالات میں فرائض انجام دے رہے ہیں بلوچستان میں مسلح گروہوں اور سرکاری اداروں کی جانب سے میڈیا پر روز بروز دباؤ بڑھ رہا ہے ان قوتوں کی ہر ممکن کوشش ہے کہ صحافیوں کو ڈکٹیشن پر چلایا جائے اور ان کے اظہار رائے کی آزادی کو مکمل طور پر سلب کر لیا جائے لیکن ہم نے تمام قوتوں پر یہ واضح کر دیا ہے کہ صحافی بلا خوف و خطر غیر جانبداری سے اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے اور صحافتی اصولوں پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ مسلح گروہ اور سرکاری ادارے صحافیوں کو سنڈوچ بنانا چھوڑ دیں کیونکہ صحافی حق اور سچ کے لیے اپنے قلم کا استعمال کرنا چاہتے ہیں ہمارا کام معاشرے کی اصلاح کرنا ہے معاشرے کو بگاڑنا نہیں اگر کسی نے اپنی خواہش کے مطابق میڈیا کو ڈکٹیشن پر چلانے کی ضد کی تو اس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوگا جو ہم قطعاً نہیں چاہیں گے۔

انگریز دور کے ظلم و جبر کا مقابلہ کرنے اپنے وجود کو برقرار رکھنے اور دور جدید میں قدم رکھنے والے بلوچستان کے صحافی ۲۰۱۲ء قبائلی سرداروں، علیحدگی پسندوں اور سکیورٹی فورسز، سیاسی جماعتوں کے دباؤ کا شکار ہیں بلوچستان کے دور افتادے علاقوں میں صحافیوں کیلئے رپورٹنگ کرنا سب سے زیادہ مشکل کام ہے جو اس ماضی میں شاید اتنا مشکل نہ ہو آج اگر کوئی قتل ہو جائے تو قبائلی سردار فون کر کے یہ دھمکی دیتے ہیں کہ یہ قتل ان کا ذاتی معاملہ ہے اور اگر اس کی خبر چلائی گئی تو اس کا مطلب ان سے ذاتی دشمنی ہے جب تک یہ خبر چلتی رہے گی صحافیوں کو دھمکیاں ملتی رہیں گی اور آئے روز مسلح افراد ان کے گھر کے سامنے کلاشنکوفوں کی نمائش کرتے رہیں گے دراصل قبائلی سردار چاہتے کہ ان کے ظلم و ستم اور جرائم کا معاملہ ان کے قصبے یا شہر میں ہی دب جائے۔ بلوچستان کے صحافیوں کے لیے ایک بڑا عذاب بلوچستان میں بلوچ علیحدگی پسند تحریک ہے۔ کالعدم تنظیموں کے بلوچ نوجوان آئے روز کوئی نہ کوئی واردات کرتے رہتے ہیں، کبھی ٹرین پر حملہ تو کبھی بم دھماکے میں بجلی کا پول اڑانا۔ علیحدگی پسندوں کا مطالبہ ہوتا ہے کہ خبر میں یہ بتایا جائے کہ یہ واردات ان کی تنظیم نے کی ہے اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہو جاتی ہیں دوسری جانب خفیہ سکیورٹی ایجنسیوں کا دباؤ ہوتا ہے کہ یا تو خبر ہی فائل نہ کی جائے اور اگر کی بھی جائے تو علیحدگی پسندوں کا نام نہ آنے پائے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دھماکے کی خبر کے ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت کے بعد کوئی کالعدم تنظیم اس کی ذمہ داری قبول کرتی ہے لیکن اس وقت تک وہ خبر ٹی وی چینل کے نیوز ایجنڈا سے ہٹ چکی ہوتی ہے۔ خفیہ سکیورٹی ایجنسی والے صحافیوں کو دھمکانے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں وہ انہیں فون کر کے کہتے ہیں کہ 'تم لوگ خبر پہلے چلا دیتے ہو جبکہ دھماکہ پانچ منٹ بعد ہوتا ہے۔' پہلے خبر چلانے کا اتنا بڑا رسک کوئی صحافی نہیں لے سکتا لیکن سکیورٹی فورسز والے محض ان پر دباؤ ڈالنے کے لیے اس طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ کالعدم تنظیموں کو ایک شکوہ یہ بھی ہے کہ انہیں دہشت گرد کیوں کہا اور لکھا جاتا ہے وہ خود اپنے لئے لفظ ''سرمچار'' کا استعمال کرتے ہیں جو بلوچی میں سرفروش کیلئے استعمال ہوتا ہے یعنی بلوچستان کے مختلف اضلاع میں فرائض انجام دینے والے صحافی و مقامی نامہ نگاران تنظیموں کو دہشت گرد لکھنے سے گریز کرتے ہیں اور عموماً کالعدم تنظیم لکھتے ہیں اور ان کے کارکنوں کے لیے مزاحمت کار کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کراچی اسلام آباد اور لاہور تک پہنچنے کے بعد لفظ دہشت گرد خبر میں شامل ہو چکا ہوتا ہے۔ بلوچستان صحافت کے حوالے سے ملک کا خطرناک ترین علاقہ بن چکا ہے، فوج اور عسکریت پسندوں کے درمیان سینڈوچ بن کر بلوچستان کے صحافیوں نے چپ سادھ لی ہے۔ صحافیوں کے پاس خبر کی ایڈیٹنگ کرنے یا قتل ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

بلوچستان کے شہید صحافی

ملک میں جب فوجی جرنیل پرویز مشرف نے جمہوریت پر شب خون مارا اور حالات بدلے تو بلوچستان میں بھی حالات نے ایک اور کروٹ لی ۲۶ اگست ۲۰۰۶ء کو ڈیرہ بگٹی اور کوہلو کے علاقے تراتانی میں ایک عسکری کارروائی کے دوران ممتاز بزرگ قوم پرست رہنماء نواب محمد اکبر خان بگٹی اپنے جاں نثار ساتھیوں سمیت جاں بحق ہو گئے جس کے بعد حالات اس طرح بدلے کہ آج تک ان پر قابو پانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں لیکن حالات ہیں کہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہے اس دوران بلوچستان میں تشدد پسندی کے رجحانات میں بہت حد تک اضافہ ہوا عدم تحفظ کے احساس کے سائے نے پورے بلوچستان کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لیا کہ کوئی بھی شخص خود کو محفوظ تصور نہیں کر سکتا آمرانہ دور سے لے کر کنٹرولڈ ڈیموکریسی کے سفر کی اس مسافت کے دوران دردمندوں کے دیس بلوچستان میں خبر کی تلاش میں سرگرداں رہنے والے کئی صحافی خود ''خبر'' بن کر رہ گئے۔

(۰۱) محمد اقبال:۔ بلوچستان سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار روزنامہ بلوچستان ٹائمز کوئٹہ میں بطور نیوز ایڈیٹر فرائض انجام دیتے تھے ۲۰۰۶ء میں بظاہر تو کوئٹہ میں انکے گھر پر ڈکیتی کی اس واردات کے دوران مزاحمت کرنے پر ڈاکو نے فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔

(۰۲) خلیل اللہ سمالانی:۔

مچھ بولان سے تعلق رکھتے تھے اور کوئٹہ سے شائع ہونے والے روزنامہ ''باخبر'' کے لئے رپورٹنگ کی خدمات انجام دے رہے تھے کراچی میں ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۷ء پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن سابق وزیراعظم محترمہ بےنظیر بھٹو کے کارواں پر ہونے والے خودکش حملے کے دوران لقمہ اجل بن گئے ۔

(۰۳) ڈاکٹر چشتی مجاہد:۔ ڈاکٹر چشتی مجاہد ماہر امراض چشم کے ساتھ ساتھ وہ شعبہ صحافت سے بھی منسلک تھے جنہیں ۹ فروری ۲۰۰۸ء کو نامعلوم مسلح افراد ان کے گھر کے سامنے فائرنگ کر کے قتل کر دیا گیا وہ کوئٹہ میں جنگ گروپ کے ہفت روزہ اخبار جہاں کے نمائندہ تھے ان کے قتل کی ذمہ داری کالعدم تنظیم بلوچ لبریشن آرمی نے قبول کی۔

(۰۴) خادم حسین شیخ:۔

بلوچستان کے علاقے حب سے تعلق رکھنے والے صحافی تھے جنہیں ۱۴ اپریل ۲۰۰۸ء کو نامعلوم مسلح افراد نے قتل کر دیا خادم شیخ روزنامہ خبریں سے وابستگی رکھتے تھے اس کے علاوہ مقامی سطح پر شائع ہونے والے روزنامہ حب نیوز کے چیف ایڈیٹر بھی تھے۔

(۰۵) وصی احمد قریشی:۔

بلوچستان کے علاقے خضدار میں روزنامہ آزادی اور بلوچستان ایکسپریس کے لئے خدمات انجام دینے والے صحافی کو ۱۰ اپریل ۲۰۰۹ء کو ٹارگٹ کلنگ میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

(۰۶) فیض ساسولی:۔

فیض محمد ساسولی بلوچستان کے علاقے خضدار کے رہائشی تھے اور شعبہ صحافت سے منسلک تھے خضدار سے بطور نامہ نگار بلوچستان سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ ''آزادی'' کے لئے اپنی خدمات انجام دے رہے تھے جنہیں ۲۷ جون ۲۰۰۹ء کو ہدف بنا کر نامعلوم مسلح افراد نے موت کی نیند سلا دیا تاہم بلوچ مزاحمتی تنظیم بلوچ لبریشن آرمی نے فیض ساسولی کے قتل کی ذمہ داری قبول کی۔

(۰۷) لالہ حمید بلوچ :۔

بلوچستان کے ضلع گوادر سے تعلق رکھتے تھے ایک طویل عرصہ تک صحافتی خدمات انجام دیتے رہے گوادر پریس کلب کے صدر کے عہدے پر فائز تھے اور روزنامہ ''توار'' مستونگ میں خدمات انجام دے رہے تھے انہیں جبری طور پر لاپتہ کیا گیا مقامی صحافیوں کا کہنا ہے کہ حمید بلوچ کو پاکستانی سکیورٹی فورسز نے ۲۵ اکتوبر کو اُس وقت حراست میں لے لیا تھا جب وہ تربت سے اپنے آبائی علاقے گوادر جا رہے تھے۔اور ۱۸ نومبر ۲۰۰۸ء کو ان کی تشدد زدہ گولیوں سے چھلنی لاش تربت شہر کے نواحی علاقے سے ان کی گولیوں سے چھلنی مسخ شدہ لاش ملی

(۰۸) محمد خان ساسولی:۔

محمد خان ساسولی خضدار سے تعلق رکھتے تھے صحافتی اور سماجی حلقوں میں انتہائی متحرک وفعال کردار ادا کرتے رہے خضدار سے مختلف اداروں کیلئے کام کر رہے تھے جن میں خبر رساں ادارہ آئی این پی، روزنامہ زمانہ کوئٹہ، بلوچستان ٹائمز شامل تھے ان کو بھی نامعلوم مسلح افراد نے ۱۴ دسمبر ۲۰۱۰ء کو اس وقت ٹارگٹ بنا کر قتل کر دیا جب وہ ورکرز کالونی میں واقع اپنے گھر کے گیٹ پر پہنچے سیاسی اور سماجی حلقوں میں محمد خان ساسولی کا احترام ان کی غیر جانبدارانہ رپورٹنگ کی وجہ سے کیا جاتا تھا اور وہ بلا امتیاز تمام طبقوں کے لیے کام کرتے تھے بلوچ مسلح دفاع نامی تنظیم کی جانب سے ایک پمفلٹ بھی تقسیم ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ خضدار کے صحافی بی ایس او اور بی این پی کے جلسوں کی رپورٹنگ نہ کریں۔

(۰۹) ملک محمد عارف:۔

ملک محمد عارف کوئٹہ کے رہائشی تھے اور میڈیا کے ساتھ بطور کیمرہ مین منسلک تھے ایک طویل عرصہ تک پاکستان ٹیلی ویژن میں خدمات انجام دینے کے بعد نیوز ٹی وی چینل ''سماء نیوز'' کے ساتھ وابستگی اختیار کی کوئٹہ بیورو آفیس میں بطور سینئر کیمرہ مین فرائض انجام دے رہے تھے ۱۶ اپریل ۲۰۱۰ء کو شہر میں فرقہ وارانہ ٹارگٹ کلنگ کا واقعہ پیش آیا تو حسب روایت کیمرے کے ساتھ وہ بھی اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ سول ہسپتال کے شعبہ حادثات میں کوریج کیلئے پہنچے لیکن تھوڑی دیر بعد وہاں ہونے والے خودکش حملے میں خود خبر بن گئے اور جان کی بازی ہار بیٹھے

(۱۰) محمد سرور :۔

بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ میں محمد سرور نجی ٹی وی چینل آج نیوز میں بطور ڈرائیور اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔کوئٹہ میں ''یوم القدس کی ریلی کے دوران خودکش حملے اور فائرنگ میں ۳۰ ستمبر ۲۰۱۰ء کو محمد سرور اپنی جان کی بازی ہار گئے۔

(۱۱)اعجاز رئیسانی :۔

اعجاز احمد رئیسانی کوئٹہ کے نواحی علاقے سریاب کے رہائشی تھے مختی نوجوان تھے مختلف نجی ٹی وی چینلز کے ساتھ بطور کیمرہ مین فرائض انجام دینے والے اس کہنہ مشق نے سماء نیوز کے ساتھ وابستگی اختیار کرلی ۰۳ ستمبر کو ہونے والی ''القدس ریلی'' کی کوریج کیلئے میزان چوک پر موجود تھے جہاں خودکش حملہ ہوگیا اور بعد میں ہونے والی فائرنگ کے دوران زخمی ہوئے ہسپتال میں ۰۶ ستمبر ۲۰۱۰ ءکوابدی نیندسوگئے

(۱۲)الیاس نذر:۔

الیاس نذر بلوچستان کے ضلع کیچ تربت سے تعلق رکھتے تھے اورایک طویل عرصے سے کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ'' توار''مستونگ کے لئے کام کررہے تھے انہیں اغواء کرنے کے بعدقتل کردیا گیا اور ان کی گولیوں سے چھلنی مسخ شدہ لاش ۰۳ جنوری ۲۰۱۱ ء کوملی۔

(۱۳)ولی خان بابر:۔

بلوچستان کے ضلع ژوب سے تعلق رکھنے والے ولی خان بابر کراچی میں نجی ٹی وی چینل جیو نیوز کے ساتھ منسلک تھے۔ ۱۳ جنوری ۲۰۱۱ ءکووہ کراچی کے پرتشدد علاقے پہلوان گوٹھ میں پولیس آپریشن کی کوریج کرکے واپس دفتر جارہے تھے جب نامعلوم مسلح افراد نے ان پر فائرنگ کرکے موت کی نیندسلادیا۔

(۱۴)عبدوست رند:۔

بلوچستان سے شائع ہونے والے اخبارروزنامہ''ایگل''میں تربت سے رپورٹنگ کررہے تھے غیر جانبدارانہ پیشہ وارانہ فرائض کی انجام دہی کرنے والے ۲۷ سالہ عبدوست رند کو ۱۸ فروری ۲۰۱۱ ءکونامعلوم موٹرسائیکل سواروں نے گولیاں مارکرقتل کردیا ۔

(۱۵)رحمت اللہ شاہین:۔

بلوچستان کے ضلع بولان مچھ سے تعلق رکھنے والے رحمت اللہ شاہین روزنامہ توار کیلئے رپورٹنگ کرتے تھے ۱۸ مارچ ۲۰۱۱ ءکو بلوچستان کے علاقے ڈھاڈر سے لاپتہ ہوگئے تھے اور یکم اپریل ۲۰۱۱ ءکوان کی گولیوں سے چھلنی مسخ شدہ لاش کوئٹہ کے نواحی علاقے سریاب سے ملی۔

(۱۶)ظریف فراز:۔

بلوچستان کے علاقے تربت سے تعلق رکھتے تھے تربت کے علاقے کلاتک سے''شاجو'' کے نام سے ایک سہ ماہی میگزین شائع کرتے تھے اور اس کے چیف ایڈیٹر تھے جنہیں ۲۱ اپریل ۲۰۱۱ ءکوگوادرزیرپوائنٹ کے مقام پرنامعلوم افراد نے بس سے اتاراجس کے بعد ۲۵ اپریل ۲۰۱۱ ءکوتربت میں مرغاپ کے علاقے میں ظریف فراز کی گولیوں سے چھلنی مسخ شدہ لاش ملی۔

(۱۷)صدیق عیدو:۔

بلوچستان کے ساحلی علاقے پسنی سے تعلق رکھتے تھے صدیق عیدوحب سے شائع ہونیوالے اردوروزنامہ'ایگل' کے لیے مکران میں رپورٹنگ کرتے اور گوادر میں انسانی حقوق کمیشن کے رکن تھے صدیق عیدواور یوسف نظر ۲۱ دسمبر ۲۰۱۰ ءکواس وقت نامعلوم مسلح افراد کے ہاتھوں اغواء ہوئے تھے جب وہ گوادر میں ایک عدالت میں پیشی کے بعد پولیس کی تحویل میں واپس پسنی جارہے تھے بلوچستان کے ساحلی شہر اورماڑہ کراس کے قریب ۲۹ اپریل ۲۰۱۱ ء کی صبح مقامی لیویز کو صدیق عیدواور یوسف نظر کی تشدد زدہ لاشیں ملیں.

(۱۸)منیر احمد شاکر:۔

منیر احمد شاکر چھٹہ قبائل سے تعلق رکھتے تھے ایک طویل عرصہ سے خبر رساں ادارے'' آن لائن انٹرنیشنل نیوز نیٹ ورک'' کیلئے خضدار سے رپورٹنگ کررہے تھے اس کے علاوہ وہ بلوچی زبان کے نیوز چینل''سبزبات'' کے لئے بھی خدمات انجام دے رہے تھے انتہائی محنتی کہنہ مشق صحافی تھے ۱۴ اگست ۲۰۱۱ ءکومنیر کونامعلوم موٹرسائیکل سوار مسلح افراد نے اس وقت فائرنگ کرکے قتل کردیا جب پاکستان کے یوم آزادی کے موقع پر بلوچ علیحدگی پسندوں کی اپیل پر یوم سیاہ کی رپورٹنگ اور کوریج کرکے پریس کلب کی طرف آرہے تھے بلوچستان کے علاقے خضدار میں آن لائن انٹرنیشنل نیوز نیٹ ورک کے رپورٹر منیر احمد شاکر سمیت تمام صحافیوں کو بلوچ قوم پرستوں بالخصوص بلوچ علیحدگی پسندوں کے پروگراموں میں شرکت اور ان کی کوریج کرنے سے منع کرتے ہوئے بلوچ مسلح دفاعی آرمی نامی تنظیم نے سنگین نتائج کی دھمکی دی تھی

(۱۹)اختر مرزا :۔

اختر مرزا بلوچستان کے سینئر صحافی اور روزنامہ جنگ کوئٹہ کے ایڈیٹر تھے ۱۶ اکتوبر ۲۰۱۱ ءکوحرکت قلب بندہونے سے انتقال کرگئے۔اختر مرزا بلوچستان ہائی کے

اس فیصلے کے بعد سخت ذہنی دباؤ میں تھے جس میں ذرائع ابلاغ کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ کالعدم تنظیموں کے بیانات شائع کرنے سے باز رہیں ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد کالعدم تنظیموں نے صحافیوں پر دباؤ ڈالا اور اصرار کیا کہ ان کے بیانات ہر صورت میں نشر اور شائع ہونگے کالعدم تنظیموں کے صحافیوں پر دباؤ کیخلاف بلوچستان یونین آف جرنلسٹ نے یکم اکتوبر ۲۰۱۱ ءکو بلوچستان بھر میں احتجاج بھی کیا۔

(۲۰) جاوید نصیر رند:۔

جاوید نصیر رند بلوچستان کے علاقے حب سے تعلق رکھتے تھے اور کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ توار کیلئے رپورٹنگ کے ساتھ ساتھ کالم نویسی بھی کرتے تھے بلوچستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر انہوں نے روزنامہ توار کو خیر باد کہہ دیا اور حب شہر میں انٹرنیٹ کیفے کھولا، حب کے مقامی صحافی نیاز شہزاد کے مطابق جاوید نصیر اپنے نیٹ کیفے میں بیٹھے تھے کہ ۱۰ ستمبر ۲۰۱۱ ءکو مسلح افراد نے انہیں اغواء کرلیا اور ڈیڑھ ماہ سے زائد کا عرصہ غائب رہنے والے جاوید نصیر کی گولیوں سے چھلنی مسخ شدہ لاش ۰۵ نومبر ۲۰۱۱ ءکو خضدار گزگی چوک سے برآمد ہوئی ۔

یہ مضمون خصوصی طور پر فردمیگزین کے لئے لکھا گیا ہے جس کے لئے ہم مصنف کے شکر گزار ہیں۔

مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:

info@individualland.com

http://tribune.com.pk/story/170963/pakistan-the-deadliest-country-for-the-media/

کارکن صحافیوں کو درپیش چیلنجز اور مواقع

تحریر: شہزادہ ذوالفقار

وفاق کے زیرانتظام قبائلی علاقہ جات کی طرح بلوچستان کو بھی گزشتہ ایک دہائی سے بدترین صورتحال کا سامنا ہے جہاں صوبائی دارالحکومت کوئٹہ سمیت بدامنی سے متاثرہ مختلف علاقوں میں اب تک بیس کے قریب صحافی جاں بحق ہو چکے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کیلئے واقعات کی رپورٹنگ کرتے ہوئے صحافی خوف میں مبتلا ہوتے ہیں کہ کہیں انہیں نقصان نہ پہنچ جائے۔

اگرچہ بلوچستان کے مختلف اضلاع میں بدامنی کا دوردورہ ہے اور اس کے نتیجے میں انہیں شورش زدہ علاقہ قرار نہیں دیا گیا تاہم وہاں کی صورتحال شورش زدہ علاقوں کی یاد دلاتی ہے۔ ان اضلاع میں نیم فوجی دستے شرپسندوں کے خلاف آپریشن کر رہے ہیں جبکہ مسلح گروہ سیکورٹی فورسز اور سرکاری تنصیبات پر حملوں میں ملوث ہیں۔

ڈیرہ بگٹی اور کوہلو جیسے بدامنی سے متاثرہ اضلاع میں بالکل رپورٹنگ نہیں ہو رہی جبکہ دوسرے اضلاع سے ملنے والی رپورٹیں اخبارات میں نظر آ رہی ہیں تاہم یہ رپورٹیں بھی سیکورٹی فورسز اور باغی گروپوں کی مرضی کے خلاف نہیں ہیں۔ کوہلو اور ڈیرہ بگٹی میں کوئی رپورٹر نہیں رہ رہا جبکہ وہاں کے ضلعی نامہ نگاروں کو فوجی آپریشن اور اس کے بعد خفیہ ایجنسیوں کے وفادار مسلح گروپوں کی طرف سے باغیوں کے خلاف کاروائیوں کی وجہ سے بے گھر ہو جانے والے دیگر افراد کے ساتھ نقل مکانی کرنا پڑتی ہے۔ تاہم یہ نامہ نگار فوجی کاروائیوں کے علاوہ دیگر واقعات کی رپورٹنگ کرتے ہیں۔ مقامی رپورٹروں کو آزادانہ رپورٹنگ کے سلسلے میں خفیہ اداروں نیز مسلح گروپوں کی طرف سے شدید دباؤ کا سامنا ہے۔ سیکورٹی فورسز اور عسکریت پسند ذرائع ابلاغ میں اپنی مرضی کے مطابق واقعات کی رپورٹنگ چاہتے ہیں اور اگر وہ کسی رپورٹ کی وجہ سے اپنے مفاد کو خطرے میں محسوس کرتے ہیں تو وہ ذرائع ابلاغ کے نمائندوں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔

وفاق کے زیرانتظام قبائلی علاقوں کی طرح بلوچستان بھی صحافت کیلئے ایک خطرناک جگہ بن چکا ہے جہاں بیس صحافیوں میں سے زیادہ تر خفیہ اداروں یا ان کے حمایت یافتہ گروپوں اور بلوچ علیحدگی پسند گروہوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

بلوچستان میں بالعموم اور بدامنی سے متاثرہ اضلاع میں بالخصوص آزادانہ رپورٹنگ کا کوئی تصور نہیں کیونکہ کوئی بھی صحافی اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر حقائق کو عوام کے سامنے لانے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کے اس عمل سے تنازعے کے کسی ایک فریق کا مفاد خطرے میں پڑسکتا ہے اور متاثرہ فریق کی طرف سے اس کا ردعمل آسکتا ہے۔ بدامنی سے متاثرہ ضلع کوہلو میں کوئی صحافی نہیں رہتا جبکہ ڈیرہ بگٹی میں صرف ایک رپورٹر واقعات کی رپورٹنگ کر رہا ہے۔ تاہم سرحدی شہر چمن سمیت باقی متاثرہ علاقوں میں سیکورٹی فورسز اور خفیہ اداروں کی مرضی کے خلاف کوئی خبر نہیں دی جاتی۔ کارکن صحافیوں کو ہراساں کرنے کیلئے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ چونکہ ضلعی نامہ نگاروں میں سے پچانوے فیصد ان ٹی وی چینلوں اور اخبارات سے جن کیلئے وہ کام کرتے ہیں کسی قسم کی تنخواہ اور الاؤنس وغیرہ نہیں لیتے اس لیے وہ سرکاری محکموں جن میں زیادہ تر محکمہ تعلیم نمایاں ہے، ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خفیہ اداروں اور سیکورٹی فورسز کی طرف سے ان کیلئے سب سے بڑی دھمکی ان کا ان کے آبائی شہر سے دور دراز علاقوں میں تبادلہ یا ملازمت سے برطرفی ہے۔

اس کے علاوہ صحافیوں کو اندرون صوبہ عسکریت پسند تنظیموں، مسلح گروپوں، جاگیرداروں، قبائل سرداروں اور سیاسی جماعتوں جیسے پریشر گروپوں کی طرف سے بھی دھمکیوں کا سامنا ہے۔

اگرچہ صوبائی دارالحکومت کوئٹہ میں کارکن صحافی قدرے مختلف ماحول میں کام کر رہے ہیں لیکن انہیں بھی اس قسم کی تنظیموں اور گروپوں کی طرف سے اسی قسم کی کھینچا تانی اور دباؤ کا سامنا ہے۔ بہت سے رپورٹر حتیٰ کہ قومی اخبارات اور ٹی وی چینلوں کیلئے کام کرنے والے سینئر صحافی بھی گمشدہ افراد کی ہلاکتوں اور ان کی لاشیں پھینکنے کے واقعات میں خفیہ ایجنسیوں کے اہلکاروں یا عسکریت پسند گروپوں کے ملوث ہونے پر خبروں میں ان کا نام ظاہر کرنے پر مسلسل دھمکیوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ یہ ایجنسیاں صحافیوں کی طرف سے صدر، وزیراعظم اور وفاقی وزراء سے ان کے دورہ بلوچستان کے دوران گمشدہ افراد کی ہلاکتوں جیسے معاملات پر صحافیوں کی طرف سے چبھتے ہوئے سوال پوچھنا بھی پسند نہیں کرتیں۔ اگر رپورٹر اس سلسلے میں اپنا رویہ تبدیل نہیں کرتے تو انہیں سنگین نتائج کے بارے میں خبردار کیا جاتا ہے۔

اسی طرح بلوچستان میں تحقیقاتی رپورٹنگ کا کوئی تصور نہیں ہے کیونکہ اس طرح کی رپورٹنگ سے صحافیوں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اگرچہ چند سال پہلے مقامی پریس میں جنوب مشرقی ضلع نصیرآباد میں غیرت کے نام پر تین خواتین کو زندہ دفن کردینے کی خبر شائع ہوئی تھی لیکن اس کے بارے میں جو بھی تحقیقاتی رپورٹنگ کی گئی وہ دوسرے شہروں میں رہتے ہوئے کی گئی۔ یہی صورتحال گمشدہ افراد یا ٹارگٹ کلنگ سے متعلق واقعات کی ہے کیونکہ کوئی بھی رپورٹر ہلاک کرنے والوں کے بارے میں لکھنے کی ہمت نہیں کرتا چاہے قاتلوں کا تعلق خفیہ اداروں سے ہو یا علیحدگی پسند گروپوں سے، علاوہ ازیں صحافیوں نیز اشاعتی اداروں یا اخبارات کی طرف سے تنازعے کے دونوں فریقوں کو خوش رکھنے کیلئے حفظ ماتقدم کے طور پر حقائق سے چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے اور خبروں کو خود ہی سنسر کردیا جاتا ہے۔ سرکاری اشتہارات کے بلاتعطل حصول کیلئے مقامی اخبارات کے مالکان ہمیشہ حکومت کی ہدایات کی پابندی کرتے ہیں۔ تاہم انہیں علیحدگی پسند گروپوں اور رہنماؤں کی طرف سے جاری کی جانے والی پریس ریلیز اور بیانات جن میں سیکورٹی فورسز اور خفیہ اداروں پر تنقید ہوتی ہے، خفیہ اداروں کا نام ظاہر کیے بغیر شائع کرنا پڑتی ہیں۔

دوسری طرف بلوچ گروپ اور سیاسی جماعتیں ذرائع ابلاغ کے رویے کے بارے میں ہمیشہ یہ گلہ کرتی رہی ہیں کہ وہ اپنے چینلز اور اخبارات میں بلوچستان کے مسائل کی مناسب کوریج نہیں کرتے۔ اخبارات کے رویے کے خلاف بطور احتجاج بلوچستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد) نامی علیحدگی پسند گروپ نے بلوچستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کوئٹہ اور صوبے کے دیگر علاقوں میں قومی اور مقامی اخبارات تقسیم کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بلوچستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (محی الدین) نامی ایک اور گروپ نے انہی وجوہ کی بناء پر صوبے کے زیادہ تر اضلاع میں نیوز چینلز کو زبردستی بند کرادیا۔

کوئٹہ میں کالعدم تنظیم لشکر جھنگوی نے ایک فرقے کے افراد کو کافر قرار نہ دینے اور دیگر قابل اعتراض الفاظ استعمال نہ کرنے پر مقامی رپورٹروں کو دھمکیاں دیں۔ بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے ایک کیس کا ازخود نوٹس لے کر کالعدم تنظیموں کے بیانات اخبارات میں شائع کرنے پر پابندی عائد کردی۔ جب اخبارات کے ایڈیٹر اور رپورٹر اپنی پوزیشن واضح کرنے کیلئے فاضل عدالت میں پیش ہوئے تو چیف جسٹس نے تحمل سے ان کا نکتہ نظر سننے سے انکار کرتے ہوئے انہیں مشورہ دیا کہ اگر انہیں کسی قسم کے دباؤ کے سامنے کا ڈر ہے تو وہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرلیں۔ تاہم ذرائع ابلاغ کی تنظیموں نے اپنے کارکنوں کی زندگیاں بچانے کیلئے لشکر جھنگوی کے دعووں کو محتاط طریقے سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ایک اور بڑا چیلنج جس کا صحافیوں کو سامنا ہے مقامی اخبارات اور نیوز چینلز میں کم تنخواہیں ہے۔ اگرچہ وفاقی حکومت نے کم از کم ماہوار اجرت سات ہزار روپے مقرر کررکھی ہے لیکن ایک خبر رساں ادارے یا اخبار میں رپورٹر کو دو ہزار سے تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے جبکہ فوٹوگرافر کو اس سے بھی کم اجرت دی جاتی ہے۔ ضلعی نامہ نگاروں اور نمائندوں کو ان کے اخبارات کی طرف سے کچھ بھی نہیں دیا جاتا حتیٰ کہ انہیں فیکس، ٹیلی فون یا انٹرنیٹ پر اٹھنے والا خرچہ تک ادا نہیں کیا جاتا۔ نیوز چینلز کا تنخواہوں کا ڈھانچہ اخبارات کی نسبت بہتر ہے لیکن ایک بڑا میڈیا ہاؤس اپنے رپورٹر کو اپنے ٹی وی چینل اور اخبار دونوں کیلئے تیرہ سے چودہ گھنٹے ڈیوٹی کیلئے پچیس ہزار روپے ادا کرتا ہے۔ اور تو اور مقامی اخبارات کے مالکان نے اپنے رپورٹروں یا فوٹوگرافروں کے علاج کیلئے جو کوئٹہ میں خودکش دھماکوں میں زخمی ہوئے، ایک پیسہ تک خرچ نہیں کیا اور حتیٰ کہ انہیں پھولوں کا گلدستہ تک بھیجنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔

جہاں تک مواقع کا تعلق ہے الیکٹرانک چینلز یا ٹریڈ یونینوں اور پریس کلبوں کے فعال کردار کے باوجود کارکن صحافیوں کو غیر جانبدارانہ اور آزادانہ رپورٹنگ کے بہت ہی محدود مواقع میسر ہیں۔ اگرچہ بلوچستان یونین آف جرنلسٹس اور کوئٹہ پریس کلب کے متحرک کردار کی وجہ سے انہیں کسی حد تک احساس تحفظ حاصل ہے لیکن دوسری طرف انہیں خفیہ اداروں اور عسکریت پسند گروپوں کی طرف سے خطرے کا احساس بھی ہے۔

ایک حالیہ واقعے میں جس میں کوئٹہ میں بی بی سی کے رپورٹر ایوب ترین کو ایک علیحدگی پسند گروپ بلوچ لبریشن آرمی کی طرف سے دھمکی دی گئی کہ اگر اس کی سرگرمیوں کو مناسب طریقے سے نشر نہ کیا گیا تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے، صحافیوں کی ٹریڈ یونین نے بڑا فعال کردار ادا کیا اور عسکریت پسند تنظیم کو اپنا بیان واپس لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ چند ماہ بعد بدامنی سے متاثرہ ضلع خضدار میں صحافی برادری نے اس وقت کام کرنا بند کردیا جب حکومت کی حمایت یافتہ ایک عسکریت پسند تنظیم نے رپورٹروں کی ایک ہٹ لسٹ جاری کی جس میں ان سے علیحدگی پسند گروپوں کی نمایاں کوریج نہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ تاہم بلوچستان یونین آف جرنلسٹس کی طرف سے شور شرابے کے بعد مذکورہ تنظیم نے اس ہٹ لسٹ سے اپنی لاتعلقی کا اعلان کردیا۔

ملک کے دوسرے حصوں کے صحافیوں کے مقابلے میں بلوچستان کے صحافیوں کو صوبے کے اندر یا باہر اپنی استعداد میں اضافے کے کم مواقع میسر ہیں۔ تاہم انڈوبجوئل لینڈ انٹرمیڈیا، انٹرنیوز اور پاکستان پریس فاؤنڈیشن جیسی کچھ تنظیمیں ان کیلئے تربیتی ورکشاپس اور سیمیناروں کا اہتمام کرکے ان کیلئے مواقع پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اس تربیت کا دائرہ کار صوبے کے دور دراز ترین علاقوں میں کام کرنے والے ضلعی نامہ نگاروں تک بڑھادیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے میڈیا ہاؤس اپنے رپورٹروں یا کیمرہ مین یا نوآموز سٹاف بالخصوص بلوچستان اور وفاق کے زیرانتظام قبائلی علاقوں کے شورش زدہ علاقوں میں کام کرنے والوں کیلئے کسی قسم کی تربیت کا انتظام نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں بہت سے صحافی اور کیمرہ مین ڈیوٹی کے دوران ہلاک ہوگئے۔ کوئٹہ میں دو کیمرہ مینوں اور ایک میڈیا نمائندے کو اس وقت جان سے ہاتھ دھونا پڑے جب وہ اجتماعات میں حساسیت کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے اور اسی دوران خودکش بمباروں نے شیعہ طبقے کے افراد کو ہدف بناتے ہوئے خود کو دھماکے سے اڑادیا۔ درحقیقت ذرائع ابلاغ سے وابستہ افراد براہ راست کوریج کیلئے عام طور پر ڈی ایس این جی ایس سمیت اپنا ساز وسامان لے کر انتہائی قریب چلے جاتے ہیں اور نتیجے کے طور پر کسی ہنگامی صورتحال میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔

یہ مضمون خصوصی طور پر فرد میگزین کے لئے لکھا گیا ہے جس کے لئے ہم مصنف کے شکرگزار ہیں۔

مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:

info@individualland.com

بلوچستان میں صحافت کو درپیش خطرات

سلیم شاہد

بلوچستان گزشتہ 170 سال سے جنگ وجدل کا مرکز رہا ہے کیونکہ انگریزوں کی اس خطے پر یلغار اور قبضے کے بعد سے یہاں امن قائم نہیں ہوسکا۔ انگریز مقبوضہ علاقوں میں اخبارات اور کتابوں کی اشاعت کی اجازت کبھی نہیں دیتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد پاکستان کی یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں نے بھی پرطانوی نوآبادیاتی نظام کی پیروی کرتے ہوئے انگریز حکمرانوں کے نقش قدم پر اخبارات پر پابندی لگانے کی خاطر کئی ایک جابرانہ قوانین متعارف کرائے۔ انگریزوں کی طرح پاکستانی حکومتوں، خاص طور پر فوجی حکومتوں نے بلوچستان کے کسی حصے میں معروضی رپوٹنگ کو کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ خان عبدالصمد خان اچکزئی بلوچستان میں برطانوی سامراج کا پہلا شکار تھا۔ انگریزوں نے اس کے ہفتہ وار اخبار ''استقلال'' پر پابندی لگاتے ہوئے اسے کئی سالوں کے لئے پابند سلاسل کر دیا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ انگریز حکمرانوں کے خلاف اور ہندوستان میں مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کے خلاف شروع کی جانے والی تحریک آزادی کے حق میں آواز بلند کر رہا تھا۔ نوابزادہ یوسف علی مگسی اور بہت سے دوسرے صحافیوں نے بھی انگریز حکمرانوں کی طرف سے نافذ کردہ مختلف قوانین کے تحت ایسی ہی صورت حال کا سامنا کیا۔

فی الوقت بلوچستان کے پریس کو سنگین صورتحال کا سامنا ہے۔ صحافیوں کو مختلف تنظیموں کی جانب سے مختلف قسم کی دھمکیاں مل رہی ہیں کیونکہ عسکریت پسند گروہ اور تنظیمیں یہ چاہتے ہیں کہ رپورٹنگ اور اخباری مضامین میں بلوچستان کے اندر ان کی سرگرمیوں کے حوالے سے ان کے نقطہ نظر کی پیروی کی جائے۔ ان خطرناک حالات میں صحافت کے پیشے سے وابستہ لوگ ''تخت یا تختہ،، کی صورت حال سے دوچار ہیں، کیونکہ دھمکیاں دینے والے گروہ دوسروں کے نقطہ نظر کے اشاعت نہیں چاہتے اور وہ صرف اپنی پسند کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے حالات میں صحافیوں کے لئے حقائق پر مبنی متوازن رپورٹنگ کرنا انتہائی مشکل ہو چکا ہے۔ اخبارات کو بھی دھمکیاں مل رہی ہیں اور صوبے میں انکے دفتر کو جلایا جاتا ہے۔ اور اخبارات کی کاپیوں کو چھین لیا جاتا ہے۔

بلوچستان میں پچھلے چار سالوں کے دوران تقریباً ۲۰ صحافیوں کو محض اس وجہ سے نشانہ بنایا گیا اور انکو قتل کیا گیا کہ ان کا طرز عمل اور رویہ حکومتی اہلکاروں، یا پریشر گروپوں سے منسلک مسلح لوگوں کے لئے قابل قبول نہ تھا۔ زیادہ تر صحافی جنہوں نے اپنی زندگی کی بازی ہار گئے ان کا تعلق خضدار، حب، گوادر، پسنی، تربتا اور قلات جیسے بلوچستان کے اندرونی علاقوں سے تھا۔ خضدار پریس کلب کے صدر محمد خان ساسولی، فیض ساسولی اور منیر شاکر کو خضدار میں قتل کیا گیا۔ بعض مقامی صحافیوں کی لاشیں مکران ڈویژن کے مختلف علاقوں سے ملیں۔ ان میں زیادہ تر لوگ کئی مہینوں سے لاپتہ تھے۔ بلوچستان یونین آف جرنلسٹس اور کوئٹہ پریس کلب کی طرف سے زبردست احتجاجی ریلیوں اور مظاہروں کے باوجود متعلقہ حکام نے صحافیوں کی ہلاکتوں کی ٹھیک طرح سے تحقیقات انجام نہیں دیں اور ابھی تک کسی بھی فرد کو نہ ہی اس قتل وغارتگری کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے اور نہ ہی کسی مجرم کو کیفر کردار تک پہنچایا گیا ہے۔ جہاں تک صوبائی حکومت کا تعلق ہے اس نے ابھی تک بلوچستان کی صحافی برادری کے تحفظ کے لئے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا۔ یہاں تک کہ صوبے میں ہلاک ہونے والے صحافیوں کے خاندانوں کو کوئی معاوضہ بھی نہیں دیا گیا۔ پچھلے دو سالوں کے دوران کوئٹہ میں ہونے والے خودکش حملوں کے دوران سماء ٹیلی ویژن نیٹ ورک سے تعلق رکھنے والے دو کیمرامین، ملک عارف اور اعجاز رئیسانی ہلاک، جبکہ ایک درجن سے زیادہ صحافی زخمی ہو چکے ہیں۔ ان صحافیوں کو ان کی متعلقہ تنظیموں کی جانب سے ناسازگار حالات یعنی لڑائی کے علاقے میں کام کرنے کی کوئی تربیت فراہم نہ کی گئی۔

بلوچستان میں عسکریت پسندی کے کئی ایک پہلو اور شکلیں ہیں۔ کئی لوگ فرقہ وارانہ تشدد کی

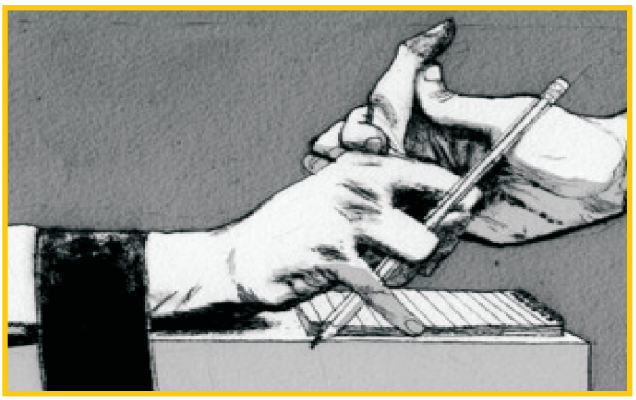

http://www.newspakistan.pk/2011/12/30/Journalists-plight-in-Balochistan/

کارروائیوں مین مصروف ہیں جبکہ کئی لوگ حکومتی اہلکاروں کے ایماء پر لوگوں کو قتل کر رہے ہیں۔ وزیرستان سے منسلک بلوچستان کے کچھ حصوں کے لئے پریس کو دھمکیاں دیتے ہیں۔ بعض سیاسی پارٹیوں میں موجود انتہا پسند عناصر اپنے سیاسی مخالفین کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور وہ پرتشدد کارروائیوں یا اخبار کے دفاتر پر حملوں کے ساتھ ساتھ صحافیوں کو دھمکانے میں ملوث پائے گئے ہیں۔

صحافی مختلف ۱۱۱۱ اطراف سے خطرات سے دوچار ہیں۔ بنیادی طور پر مذہبی جنونی اور فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات میں ملوث افراد، طالبان کے حامی اور مختلف طریقوں اور انداز سے ان کے ہمدرد صحافیوں کو دھمکیاں دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ پہاڑوں پر موجود سیکورٹی فورسز کے خلاف برسرپیکار عسکریت پسندوں کے مددگار عناصر بھی بعض دفعہ صحافیوں پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ سیاست میں کچھ ایسے جرائم پیشہ عناصر بھی موجود ہیں جن کے خلاف درجنوں فوجداری

چھاپ دیتے ہیں ایسے حالات میں ان ذرائع کا علم سب کو ہے جو مضامین چھپواتے ہیں اور اخباری بیان جاری کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ سب کو علم ہوتا ہے کہ یہ مضامین اور بیانات کس کے خلاف ہیں۔

بلوچستان ایک سخت قبائلی معاشرہ ہے جس برداشت اور رواداری کا عنصر تقریبًا نہ ہونے کے برابر ہے۔ قبائلی سرداروں اور عمائدین کے خلاف کسی قسم کی تنقید سختی کے ساتھ منع ہے اور اس کو قبیلے، اس کے سردار اور عمائدین کی توہین اور بے عزتی خیال کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے سیاست میں موجود قبائلی سردار اور عمائدین بھی تنقید سے مبرا ہیں اور اگر کوئی صحافی قبیلے کی روایات کو توڑنے کی ہمت کرے تو اس کو انتقام کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ تاہم کچھ مستثنیات موجود ہیں، کیونکہ بعض قبائلی رہنما مضبوط جمہوری روایات اور اقدار کے امین ہیں جو اپنے سیاسی طرزِ عمل پر تنقید کی نہ صرف تعریف کرتے ہیں بلکہ وہ اپنے سیاسی مخالفین کے خیالات کو برداشت کرتے ہیں۔ بلوچستان میں صحافی ایسے حالات میں کام کرنے پر مجبور ہیں جہاں پر ایک طرف گہرا سمندر تو دوسری طرف آگ کا الاؤ موجود ہے۔

بلوچستان پاکستان کا سب سے کم ترقی یافتہ صوبہ ہے جہاں پر پیشہ ور صحافیوں کی کمی بھی ایک مسلئہ ہے۔ اس صوبے میں بہت کم پیسہ ور صحافی کام کرتے ہوئے ملیں گے۔ اور ان کو بہر صورت معاشرے میں ان کے کام کی وجہ سے عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر طرف انتشار اور بدامنی کے باوجود کم تعداد میں پیشہ وارانہ امور میں ماہر صحافی پریس کے لئے کام کر رہے ہیں۔ صحافت کے شعبے میں نئے آنے والے لوگوں کو مناسب تربیت فراہم نہیں ہو سکی۔ مزید یہ کہ ان کی تربیت کے لئے ادارے موجود نہیں ہیں جہاں پر پیشہ ور ماہرین ان کی نیوز روم یا فیلڈ کے لئے تربیت کا اہتمام کرسکیں۔

بلوچستان یونیورسٹی میں ابلاغ عامہ کا شعبہ موجود ہونے کے باوجود صوبے میں صحافت کا معیار دن بدن زبوں حالی کا شکار ہے۔ موقع پرست لوگ اہم عہدوں پر براجمان ہیں یا پھر انہوں نے راتوں رات امیر بننے کے لئے اور لاکھوں روپے کمانے کے لئے اپنے ڈمی اخبارات نکال لئے ہیں۔ اخبارات میں اہم عہدوں مثلاً چیف ایڈیٹر، ایڈیٹر، منیجنگ ایڈیٹر، نیوز ایڈیٹر، سب ایڈیٹر اور رپورٹر کے عہدوں پر ایسے لوگ کام کر رہے ہیں جو پیسہ ورانہ صحافت سے نابلد ہیں۔ اسی طرح سے بعض ٹیلی ویژن چینلز نے بھی ایسے افراد کو اہم عہدوں پر متعین کیا ہوا ہے جنھوں نے نہ ہی مناسب تربیت حاصل کی ہے اور نہ ہی وہ کسی قسم کی پیشہ ورانہ قابلیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بحرانی کیفیت میں حالات و واقعات کی رپورٹنگ کی قابلیت نہیں رکھتے اور اس طرح انہوں نے بلوچستان میں صحافت کو خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ ان کے اپنے متعلقہ دفاتر بھی ایسے لوگوں کو نیوز روم کے لئے بوجھ تصور کرتے ہیں، کیونکہ وہ کافی عرصے تک کام کرنے کے باوجود بھی صحافت کے معیار کو بلند کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

کچھ پیشہ ور صحافیوں کو جو بعض ٹی وی چینلز کی سربراہی کر رہے تھے ریاستی اہلکاروں کی ہدایات پر نوکری سے برخاست کر دیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے پیشہ ورانہ فرائض میں مداخلت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بلوچستان میں موجود اقتصادی بحران کی وجہ سے بھی اخبارات کم آمدنی کی وجہ سے اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ اس اقتصادی ح۔ بحران کا پہلا ہدف وہ صحافی ہیں جو معمولی تنخواہ وصول کرتے ہیں یا بعض حالات میں چھ سے آٹھ ماہ تک کے عرصے کے لئے انہیں کوئی تنخواہ نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ بڑے اخبارات اور ٹی وی چینلز تنخواہوں کی ادائیگی نہیں کر رہے ہیں اور وہ اپنے ملازمین کو کئی ماہ سے بغیر تنخواہ دیئے کام جاری رکھنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔

صوبے کے اندرونی علاقوں میں حالات اور بھی ابتر ہیں کیونکہ مقامی صحافی جو اخبارات اور نجی نیوز چینلز کے لئے کام کر رہے ہیں انہیں تنخواہ یا پھر دیگر کسی قسم کی سہولت نہیں دی جا رہی ہے۔ میڈیا ہاوسز ان کو صرف شناختی کارڈ فراہم کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کیمرے یا دیگر ایکوپمنٹ فراہم نہیں کیا جاتا مگر ان سے ہر واقعے کی کوریج کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ صرف دو یا تین نجی ٹی وی چینلز ایسے ہیں جو اپنے ضلعی نمائندوں کو ماہانہ ۳۰۰۰ سے ۵۰۰۰ ہزار روپے کی ادائیگی کرتے ہیں۔ ٹی وی چینلز کے مالکان تنخواہ یا دیگر مطلوبہ مراعات یا سہولیات نہ دینے کے باوجود اس بات کے متقاضی ہیں کہ مختلف اضلاع میں رونما ہونے والے تمام واقعات کی مکمل کوریج کی جائے۔ اخبارات کے مالکان بھی اسی قسم کا طرز عمل اپنے نامہ نگاروں کے ساتھ صوبائی دارالحکومت کوئٹہ میں بھی اپنائے ہوئے ہیں۔ اس مالی بحران اور الیکٹرانک میڈیا اور اخبارات کے مالکان کے اس رویے کی وجہ سے بلوچستان کے صحافیوں میں سخت تشویش پائی جاتی ہے اور وہ کرپٹ پریکٹسز کی طرف مائل ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میڈیا کے بعض لوگوں کی طرف سے کرنسی نوٹوں سے بھرے لفافے قبول کرنے کی شکایات منظر عام پر آئی ہیں۔ اس قسم کی حرکات نہ صرف بلوچستان میں بلکہ ملک کے دوسرے حصوں، بشمول وفاقی اور صوبائی دارالحکومتوں اور دوسرے بڑے شہروں میں بھی سامنے آئی ہیں جو صحافت کے نام کو بدنام کرنے کا باعث ہیں۔

یہ مضمون خصوصی طور پر فرد میگزین کے لئے لکھا گیا ہے جس کے لئے ہم مصنف کے شکر گزار ہیں۔
مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

Individualland
Creating space for the individual

فرد کے اس شمارے کی توجہ کا مرکز 'بلوچستان میں میڈیا کے حالات' ہیں۔ اس کوشش کا مقصد ہرگز بھی، میڈیا کے مختلف دھڑوں کو یہ احساس دلانا نہیں ہے کہ انہیں اپنا کام کیسے کرنا ہے بلکہ موجودہ صحافت کے اس پہلو کہ سمجھنا ہے کہ کیا ہمیں ہمارا معلومات کا حق دستیاب ہے؟ خصوصاً بلوچستان کے تناظر میں۔ ایسا لگتا ہے جیسے بلوچستان سے ایک ہی قسم کی خبریں ارسال ہو رہی ہیں۔ کیا یہ خبریں کافی ہیں یا نہیں؟

لبرل نقطہ نظر کے تحت یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا ایک معاشرے کے تمام حصوں کو نمائندگی کے مواقع دستیاب ہیں یا نہیں؟ لبرل نقطہ نظر صرف جمہوریت اور ریاست کی کم سے کم مداخلت تک محدود نہیں بلکہ ہم لبرلز کی حیثیت سے آزادی رائے اور اجتماعیت پر بھی زور دینا چاہتے ہیں، جو بلوچستان جیسے صوبے میں بے حد مصیبت میں ہیں۔ بلوچستان میں نا صرف لبرل اقدار بلکہ یوں لگ رہا ہے کہ صوبے کی کوریج کو نشانہ بناتے ہوئے آزادی رائے کا گلہ گھونٹا جا رہا ہو۔ صوبے کے درمیان اور اردگرد سے آنے والی خبروں سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا میڈیا بلوچستان کے حوالے سے ہمیں باخبر رکھنے کی بجائے ہماری معلومات میں کمی کر رہا ہے؟ ہمیں جس قسم کی خبریں پہنچ رہی ہیں ان کا مقصد کیا ہے؟ یہ چند سوالات ہیں جن کے جوابات ہم نے میڈیا کے مختلف ذرائع کو تنقیدی طور پر جانچنے کے بعد 'بلوچستان اردو میڈیا کی نظر میں' کی صورت میں پیش کئے ہیں۔

صوبے کے بارے میں روز جاری ہونے والی خبروں سے اور سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو اخبارات سے یہ ظاہر ہے کہ 'بلوچستان ہیڈ لائنز میں نہیں' ہے۔ انگریزی اخبارات بھی کچھ ایسی ہی تصویر پیش کر رہے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف آن لائن اور الیکٹرانک میڈیا صوبے سے متعلق کیا بتا رہے ہیں ہم 'بلوچستان آن لائن' اور 'بلوچستان بلیٹن' کی صورت میں جان پائیں گے۔

بلوچستان پرنٹ میڈیا کی نظر میں

ذوالفقار حیدر

میڈیا پر تحقیق کرنے والے ایک ادارے کی رپورٹ 'پریس دباوٴ میں۔ بلوچستان میں میڈیا خطرے میں' کے مطابق بلوچستان کو 'صحافت کیلئے سب سے پرخطر ملک کا سب سے پرخطر علاقہ قرار دیا گیا ہے۔'

فروری ۲۰۱۲ میں بلوچ قوم پرست تنظیموں کی دھمکیوں کی وجہ سے کوئٹہ کے تمام کیبل آپریٹروں نے اردو زبان کے ٹی وی چینلز پر پابندی عائد کر دی۔ البتہ شہری، فوج اور قوم پرست، تمام گروہ بلوچستان کی موجودہ صورتحال پر متضاد خیالات رکھتے ہیں۔ کچھ افراد میڈیا کو مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں جب کہ دوسروں کا خیال ہے کہ دونوں اطراف یعنی ریاستی اداروں اور قوم پرست جماعتوں کے دباوٴ کی وجہ سے میڈیا نے خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔

آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی کی ویب سائٹ پر ۲۰۱۲ کے تخمینوں کے مطابق مجموعی طور پر بلوچستان میں اردو زبان کے ۲۳ اخبار موجود ہیں۔ تاہم، ان کی گردش کے اعداد و شمار کے بارے میں معلومات نا ہونے کے برابر ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا بلوچستان کو کوریج کیوں نہیں دے رہا؟ اس کی وجوہات جاننے سے پہلے یہ جاننا زیادہ اہم ہو گیا ہے کہ قومی اور علاقائی پرنٹ میڈیا بلوچستان کو کس قدر کوریج فراہم کر رہا ہے؟ ایک بہت اہم وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ پچھلے چند سالوں میں بلوچستان ایک جنگ زدہ علاقے میں تبدیل ہو چکا ہے اور سکیورٹی خدشات کی بناء پر صحافی وہاں جانے سے گھبراتے ہیں۔ پچھلے دو سالوں میں بلوچستان میں بہت سے صحافی مارے جا چکے ہیں، تاہم صحافیوں کا یہ خوف جائز ہے۔

بلوچستان کی صحافی برادری اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ صوبے کے حالات پر لکھنے کو بہت کچھ ہے مگر یہ رکاوٹیں ان کا راستہ روک دیتی ہیں۔ جیسا کہ آزادی پسند عناصر کے بارے میں لکھنے کا خوف اور بغیر کسی حفاظت کے دور دراز علاقوں میں جانے کا خوف وغیرہ۔

انہی وجوہات کی بناء پر بدقسمتی سے بلوچستان انگریزی اور اردو اخبارات کے ادارتی صفحات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ بلوچستان کے بارے میں وزیر داخلہ کا بیان یا سپریم کورٹ کا لاپتہ افراد کے بارے میں از خود نوٹس جیسی خبریں ہی اخبارات کی زینت بن پاتی ہیں۔

پچھلے چار ہفتوں میں میں نے اردو زبان کے دو معروف اخبارات، روزنامہ جنگ اور روزنامہ نوائے وقت کا مطالعہ کیا مگر نتائج کافی افسوس ناک رہے۔ شہ سرخیوں اور آراء پر مبنی مضمون کے علاوہ بلوچستان پر کوئی خاص خبر موجود نا تھی اور یہ ادارتی مضامین بھی یا تو لاپتہ افراد کے متعلق تھے یا صوبے میں تنازے کا تجزیہ کرتے دکھائی دیتے تھے۔

کیا بلوچستان کی کوریج اس حد تک نیچے آ چکی ہے؟
بجائے اس کے کہ صحافی حضرات دوسرے صوبوں میں بیٹھ کر بلوچستان پر تجزیے کریں، انہیں چاہیے کہ وہ تنازعاتی علاقوں میں صحافت پر تربیت حاصل کریں اور خود وہاں موجود رہ کر سیاست اور جنگ کے علاوہ بھی رونما ہونے والے واقعات کی خبریں لوگوں تک پہنچائیں۔ مگر صرف میڈیا پر تنقید کرنے سے معاملات حل نہیں ہوں گے۔ ہماری حکومتوں نے ہمیشہ بلوچستان کو نظر انداز کیا ہے۔ صوبے میں ترقیاتی کام نا ہونے کے برابر ہیں، مناسب تعلیمی نظام بھی موجود نہیں اور امن و امان کی صورتحال سے ہم سب واقف ہیں۔ موجودہ حکومت بھی

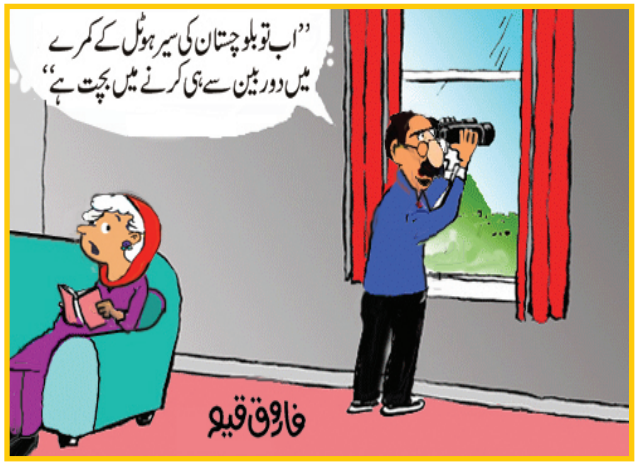

غلطیوں کو درست کرنے کی بجائے غیر ضروری اصلاحات پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ کئی بار ایسے محسوس ہوتا ہے کہ فوج اور حکومت دونوں مل کر اس صوبے کو ایک جنگ زدہ علاقے میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔

مقامی صحافیوں کو بھی حکومت کی جانب سے خطرات لاحق رہتے ہیں۔ سکیورٹی ایجنسیوں نے بہت سے اخبارات پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ حال ہی میں ایک ایڈیٹر نے ایف سی کے انٹیلی جنس یونٹ کی لگاتار نگرانی کی وجہ سے احتجاجاً اپنے اخبار کو بند کر دیا۔ ایک مقامی صحافی کے مطابق انٹیلی جنس ایجنسیاں معلومات پر اپنا اثر برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اردو میڈیا آزاد نہیں ہے۔

شر پسندوں نے معاملات کو مزید بدتر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور بلوچستان کو مکمل تباہی کے دہانے لا کھڑا کیا ہے۔

ایک بات جو ہر کوئی بھول جاتا ہے وہ یہ ہے کہ بلوچستان کے شہری حکومت اور قوم پرست عناصر کے درمیان پھنس کر رہ گئے ہیں۔ یہاں کے شہری امن پسند ہیں اور اس ملک کا حصہ ہونے پر فخر کرتے ہیں، اور یہ تعداد میں بھی زیادہ ہیں۔

اردو اس ملک کی قومی زبان ہے اور سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اگر اردو میڈیا اس صوبے کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کرے گا اور اسے ادارتی صفحات میں تجزیات تک محدود رکھے گا تو یقیناً یہ اپنا فرض پورا نہیں کر رہا۔

اگرچہ اس جدید دور میں الیکٹرانک میڈیا کی اہمیت بڑھ چکی ہے مگر اردو پرنٹ میڈیا آج بھی اپنی ایک جداگانہ حیثیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ بہت سے لوگ اپنے دن کا آغاز اخبار کے مطالعے سے کرتے ہیں اور اردو اخبارات ان کے لئے معلومات کے اہم ذرائع ہیں۔ اردو اخبارات کو صوبے میں تنازعات کے بارے میں معلومات ضرور فراہم کرنی چاہیے مگر یہ بہتر ہوگا اگر وہاں ہونے والے دیگر واقعات کو بھی اپنے اخبارات کی زینت بنا لیا جائے۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

۹ بجے: بلوچستان بلیٹن

یحییٰ احمد

شائقین کی پسندیدگی اور خبر نویسوں اور تجزیہ کاروں کی تنخواہوں میں اضافے سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ پاکستانی عوام میں خبروں اور حالات حاضرہ کیلئے کس قدر تشنگی موجود ہے (ایک ویب سائٹ کے مطابق جیو کے نجم سیٹھی بیس لاکھ اور ڈان نیوز کے طلعت حسین اٹھارہ لاکھ روپے تنخواہوں کی مد میں کماتے ہیں)۔ یہی خبریں جو ایک زمانے میں کافی سادگی سے نشر کی جاتی تھیں، اب تفریحی پروگراموں میں تبدیل ہو چکی ہیں اور چھوٹوں اور بڑوں، دونوں کی تفریح کا باعث بنتی جا رہی ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے میں دسیوں خبروں کے چینل شروع ہو چکے ہیں، جو کہ مستند حقائق سے پردہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں چوٹی کے چینل بننے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ باوجود اس کے کہ بہت سے چینل ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مصروف ہیں اور مگر یہ کہنا غلط نا ہوگا کہ میڈیا واقعی ان سنوں کی آواز بن کر سامنے آیا ہے۔

تصور کیجیے کہ تمام ٹی وی چینل سرکاری حکام کی نگرانی میں کام کر رہے ہوتے؟ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً ہر خبر نویس کی خبریں اور حتا کہ مہمانوں کی باتیں بھی سرکاری حکام کی اجازت کے بغیر نشر کرنا مشکل ہوتا۔ اور تمام تر خبریں اور تجزیات حکومت کی تعریف کے گرد ہی گھومتی رہتیں۔ کبھی تو بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کی تعریفوں کے پل باندھے جا رہے ہوتے اور کبھی بلاول بھٹو کی آکسفورڈ یونیورسٹی سے گریجوایشن کی کہانیاں سنائی جا رہی ہوتیں اور سب سے بڑھ کر بختاور بھٹو کو دو ننھی بلیوں کی جان بچاتے ہوئے دکھایا جا رہا ہوتا۔ مگر شکر ہے کہ سابقہ صدر نے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل کر دیا۔

انتباہات اور پیمرا کی طرف سے اٹھائے گئے اقدامات کے باوجود جلاوطن ہونے والے بلوچ رہنماؤں کو بہت سے ٹی وی چینلوں پر براہ راست لیا گیا تا کہ وہ خود اپنی بات لوگوں تک پہنچا سکیں اور محترم وزیر داخلہ جناب رحمان ملک کی حال ہی میں دیئے گئے بیان کا جواب دے سکیں۔ میرے سمیت بہت سے پاکستانیوں نے حکومت پاکستان کو ایک بار پھر اپنا مزاق اڑاواتے ہوئے دیکھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر آج ہمارے ملک کا میڈیا آزاد نا ہوتا تو حکومت ہر گز 'لاپتہ افراد' کے کیس پر توجہ نا دیتی۔ اب بھی سپریم کورٹ کے نوٹس کے باوجود حکومت اس مسئلے کو حل کرنے میں ناکام رہی ہے، اور اس بات کو بھی منظر عام پر میڈیا ہی لے کر آیا۔

بلوچستان کو نہایت ہی مشکل حالات کا سامنا ہے۔ اس صوبے سے آنے والی خبروں سے صاف ظاہر ہے کہ وہاں امن و امان کی صورت حال کافی حد تک خراب ہو چکی ہے، اور انتظامیہ نا ہونے کی برابر ہے۔ اور سب سے بڑھ کر نوجوانوں کو روزگار کے مواقع بھی میسر نہیں اور یہ کہ بلوچستان اسمبلی میں اپوزیشن نامی کوئی چیز موجود نہیں۔ اسلام آباد میں رہتے ہوئے ان تمام مسائل کے بارے میں مجھیجا نکاری صرف اور صرف میڈیا کے وجہ سے ہوئی ہے۔ ٹیلیفون پر کئے گئے ایک سروے کے مطابق ۵۰ میں سے ۳۰ بلوچ میڈیا کے کردار کو سراہتے ہیں البتہ ان میں سے بہت سے یہ خیال بھی رکھتے ہیں کہ میڈیا نے بھی پوری طرح ان کے مسائل پر روشنی نہیں ڈالی۔ اور حقیقت واقعی کچھ ایسی ہی ہے، مثال کے طور پر اے آر وائی اور ایکسپرس نیوز کے چند میزبان تو صرف بحث کی گرمی کو بڑھانے کی خاطر مہمانوں سے

عجیب و غریب سوالات پوچھتے ہیں۔

بہت سے دوسرے ٹی وی چینلوں جیسا کہ جیو اور ڈان پر بحث کے مختلف پہلو ڈھونڈے جاتے ہیں اور اس صوبے کے مسائل کو ذیر غور لایا جاتا ہے۔ بلوچستان کے حالات پر بحث مباحثوں سے درکنار میں نے آج تک اس صوبے اور یہاں کی عوام کے مسائل اور ان کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی ہوتے ہوئے نہیں دیکھی۔ مرحوم نواب اکبر بگٹی کے ایک دو انٹرویوں کے علاوہ میں نے آج تک وہاں کے کسی لیڈر کے بارے میں کوئی معلوماتی ڈاکیومنٹری یا ویڈیو نہیں دیکھی۔ ان کے علاوہ اس صوبے کے اداکار، یہاں کے فنکار اور کھلاڑی آخر کہاں ہیں؟ آخر ہمارا میڈیا ان پر کوئی خبر کیوں نہیں دیتا؟ اب ایسا بھی نہیں کہ پورے بلوچستان میں کسی کے پاس سنانے کو کوئی کہانی نہیں ہے۔ پچھلے دنوں یقیناً بلوچستان کے نوابوں کی زندگیوں پر ایک ڈرامہ نشر کیا گیا تھا مگر افسوس یہی ہے کہ میڈیا نے اس صوبے کی کوریج اپنی

مرضی کے مطابق کی ہوئی ہے۔میڈیا کا یہ فرض ہے کہ وہ کم ازکم بلوچی عوام کی کڑواہٹ کا ذکر تو کرے۔

الیکٹرانک میڈیا اب صرف خبروں تک محدود نہیں رہا۔اب یہ چینلز خبروں،تفریحی پروگراموں اور بحث مباحثوں کے علاوہ بھی بہت کچھ نشر کرتے ہیں۔اب تو بہت سے چینلز بڑے اداروں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارا میڈیا اس صوبے کی معصوم عوام،مسکراتے بچوں اور مہمانوازی کے بارے میں بھی خبر دے،تاکہ دنیا ان کے بارے میں جان سکے۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

بلوچستان خبروں میں کہیں نہیں

حمزہ خان

ماضی کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کوئی بھی ماضی سے 'اگر' جیسے سوالات کر کے اپنے ذہن کی گرہیں کھول سکتا ہے، تا کہ زندگی کی الجھنوں کو اور بہتر انداز میں سمجھا جا سکے۔ پھر ماضی سے ایسے سوالات کرنا جائز ہے جیسے اگر میڈیا ۱۹۷۱ میں بھی ایسے ہی آزاد اور خودمختار ہوتا جیسا کہ آج ہے تو کیا ہوتا؟ اگر میڈیا آزاد ہوتا تو پھر مشرقی پاکستان میں کیا ہوتا؟ کیا مشرقی پاکستان یہ ناگزیر آزادی کسی اور طرح حاصل کر پاتا؟ کیا اس سلسلے میں میڈیا اپنا کوئی کردار ادا کرتا؟ اور ایسے کئی سوالات محض تاریخ سے پوچھے جا سکتے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ نا ہی گزرا ہوا وقت واپس آ سکتا ہے اور نا ہی انسان ماضی کو بدل سکتا ہے۔

مگر اس بحث کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ہم اپنی غلطیوں سے سیکھ سکتے ہیں تا کہ انہیں آئندہ دہرایا نا جائے۔ میں جس نقطے پر روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ۱۹۷۱ میں مشرقی پاکستان کا سانحہ ہمارے سامنے ہے اور آج کا میڈیا بھی کہیں زیادہ متحرک ہے۔ اور ہمیں کچھ ویسے ہی حالات کا سامنا ہے اور ہمارا ایک اور صوبہ بلوچستان، ایک ایسے دہانے پر آ پہنچا ہے جہاں اس کی صورت حال مشرقی پاکستان سے کچھ مختلف نہیں۔ وہاں کے کچھ موجودہ گروہ ایسے ہیں جو آزادی سے کم کسی قیمت پر آمادہ نہیں۔ کیا آج کا میڈیا بلوچستان کے حالات کی بہتری میں کوئی کردار ادا کر پائے گا؟ حالات یہ ہے کہ موجودہ حکومت بھی چند نمائشی اقدامات کے علاوہ کچھ نہیں کر رہی۔ یہاں تک کہ خود کو جلاوطن کرنے والے بلوچ رہنماؤں کے خلاف مقدمات ختم کرنے کا اقدام بھی ایک بیکار کی کوشش ثابت ہوئی اور مسائل حل کرنے میں ناکام رہی۔

کیا ہم اپنی گزشتہ غلطیوں سے کچھ نہیں سیکھے؟ کیا میڈیا بلوچستان کی کورتج کو بہتر بنا پائے گا؟ آخر میڈیا وہاں کیا کر رہا ہے؟ یہ تمام سوالات ابھر کر سامنے آتے ہیں جب کوئی شخص بلوچستان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ انگریزی زبان کے اخبارات قبل از آزادی گردش میں ہیں، اور کافی تجربے کے حامل ہیں۔ اسی تجربے نے کئی مقامات پر انہیں اہم انکشافات کرنے میں مدد دی ہے اور مجرموں کو انجام تک پہنچایا۔ مگر جب یہی اخبارات بلوچستان پر خبر رسانی کر رہے ہوں تو ان تمام باتوں کو حقیقت مانا جا سکتا ہے؟ کیا وہ واقعی بلوچستان کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں یا صرف موجودہ حکومت کی غلطیوں پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں؟ مگر لگتا یہی ہے کہ میڈیا عوامی مسائل سے درکنار صرف حکومتی کمزوریوں پر روشنی ڈالنے میں مصروف ہے اور یہ ذہن نشین کرنا اہم ہے کہ دونوں صورتوں میں بہت فرق ہے۔

یہ نہایت اہم بات تھی کہ بلوچستان کی کورتج کے بارے میں جاننے کیلئے ہم چند انگریزی اخبارات کا تفضیلاً مطالعہ کریں۔ وقت اور ادارتی پابندیوں کے باعث میں نے صرف فروری کے مہینے میں ڈان اخبار کا تجزیہ کیا اور اس مہینے کی اہم خبریں لا پتہ افراد اور قتل کے واقعات کے گرد گھومتی رہیں۔ یہ خبریں بھی مرکزی صفحے کے ایک کونے تک محدود تھیں۔ دیگر خبریں جیسا کہ بلوچستان کابینہ، پاکستان مسلم لیگ (ق) کے چیئرمین کا بیان اور بلوچستان کے کاروباری طبقے کے بارے میں کچھ خبریں قومی صفحات پر چھپی ہوئی تھیں۔ ان خبروں کے علاوہ شاید ہی کوئی اداریہ لکھا گیا ہو جس سے بلوچستان کے بارے میں اس اخبار کے نقطہ نظر کا اندازہ لگایا جا سکے۔ سیرل المیڈا اور آئی اے رحمان کے لکھے ہوئے چند مضامین میں بلوچستان میں گیس پائپ لائنوں کے اڑائے جانے اور وہاں امن کے قیام کی کوششوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ پاکستان بھر میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے انگریزی اخبار کی بلوچستان کے بارے میں سنجیدگی سے وہاں کے حالات کا اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اخباروں میں چھپنے والی خبریں بیانات، کانفرنسوں اور اسمبلی کی کاروائی کے گرد گھومتی ہیں۔ تجزیات اور

تفتیشی مضامین بھی نا ہونے کے برابر ہیں۔ ایک مہینے کے تجزیے میں بلوچستان پر اس سے زیادہ کچھ نہیں ملا۔

میڈیا صارف اور ٹیکس دینے والے شہری کی حیثیت سے میں بلوچستان کے بارے میں خبریں دیکھنا، سننا اور پڑھنا چاہتا ہوں۔ وہاں کتنے اسکول موجود ہیں، اور اگر نہیں ہیں تو کیوں نہیں ہیں؟ میں وہاں کے اسپتالوں کی حالت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ آخر حکومت بلوچستان کے دور دراز علاقوں میں اسپتال اور دیگر سہولیات فراہم کرنے میں ناکام کیوں رہی

ہے؟ اگر ممکن ہو تو کم از کم اتوار کے روز ہی یا مہینے میں ایک دن ہی بلوچستان پر ایک مفصل مضمون عوام کو وہاں کے حالات کے بارے میں جاننے میں مدد دے سکتا ہے۔

بلوچستان کو مرکز کی جانب سے ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ خواہ ترقی کے کام ہوں، تعلیم ہو یا ثقافت، یہاں تک کہ کھیلوں میں بھی اس صوبے کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ سطحی اقدامات کے علاوہ اس صوبے اور اس کی عوام کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ موجودہ وقت کی ضرورت ہے کہ ہم بلوچستان کو اپنے ملک کا اہم جز تسلیم کرنا شروع کریں، تاکہ ماضی میں کی گئی غلطی کو دوبارہ دہرایا نا جائے۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

بلوچستان آن لائن

فرحان خالد

اگر کبھی آپ کو لفظ 'بلوچستان' کو گوگل کرنے کا اتفاق ہوا ہو تو مندرجہ ذیل جوابات سامنے آئیں گے:

- بلوچستان کا بحران
- بلوچستان کا مسئلہ
- بلوچستان اور لاپتہ افراد
- بلوچستان اور غربت
- بلوچستان لبریشن پارٹی

یقیناً یہ دکھ کی بات ہے کہ بلوچستان جیسا صوبہ جہاں قدرتی وسائل کی کوئی کمی نہیں اور جو سنگلاخ پہاڑوں اور قدرتی حسن سے مالا مال ہے، پوری دنیا کیلئے ایک 'مصیبت زدہ' علاقہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بلوچستان کو بہت سے مسائل کا سامنہ ہے اور آجکل اس کی شہرت تمام تر غلط وجوہات کی بنا پر ہے۔ مگر کیا بلوچستان صرف تنازعات اور لڑائی جھگڑے کا دوسرا نام ہے؟

آخر ہم اس صوبے کے متعلق کوئی اچھی خبر کیوں نہیں سن پاتے؟ ایک ایسا صوبہ جسے قدرت نے وسائل سے مالا مال کر رکھا ہے اور یقیناً جو پاکستان کو معاشی برتری دلانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا میڈیا بلوچستان کو پہلے ہی ایک شکست یافتہ محاذ قرار دے چکا ہے۔ ہم میں سے اکثر یہ شکایت کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ بین الاقوامی میڈیا ہمیشہ ہمارے ملک کے منفی پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے، جو کہ ہرگز درست نہیں۔ مغربی میڈیا ہمارے ملک کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا، تاہم وہ جو بھی رپورٹ کرتا ہے وہ کسی نا کسی طرح درست ہی ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ ہمارا اپنا میڈیا ہے جو راستے سے ہٹ چکا ہے اور تمام تر حقیقت سے آشنا ہونے کے باوجود صرف ایک رخ پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔

انیسویں صدی ایجادات کی صدی تھی، جبکہ بیسویں صدی کو طب کی صدی بھی کہا جاتا ہے اور موجودہ صدی یقیناً ٹیکنالوجی کی صدی کہلائے گی۔ موجودہ وقت میں بھی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا معلومات کے اولین ذرائع ہیں۔ مگر گلوبلائزیشن کے اس زمانے میں ہم پوری دنیا سے انٹرنیٹ کے ذریعے جڑے ہوئے ہیں۔

اس مضمون کے سلسلے میں تحقیق کے دوران میں نے تین آن لائن ویب سائٹس، ایکسپرس ٹریبیون، پاکستان ٹوڈے بلاگ اور چورنگی بلاگ کا تجزیہ کیا۔ جب آپ بلوچستان کا لفظ لکھیں تو بلاگز کی ایک لمبی لسٹ سامنے آجاتی ہے۔ ان بلاگز میں سے زیادہ تر بلوچستان کے سیاسی بحران، فوج کی مداخلت اور قدرتی وسائل کی دریافت اور تلاش کے بارے میں تھے۔ سب سے خوش آئیند بات یہ تھی کہ لوگ ان بلاگز کو باقاعدگی سے دیکھ رہے تھے اور ان پر اپنے تبصرے بھی کر رہے تھے۔ جیسا کہ ایک بلاگ پوسٹ، جس کو یعقوب خان بنگش نے لکھا تھا اور جس کا عنوان، 'بلوچستان کی تاریخ کو یاد کرنا' تھا، پر بہت سے لوگوں نے تبصرے کیے ہوئے تھے۔ البتہ پچھلے دو ہفتوں (۹ تا ۲۳ اپریل ۲۰۱۲) میں میں نے دو بلاگز، ایکسپرس ٹریبیون اور پاکستان ٹوڈے کو باقاعدگی سے دیکھا، اور ان کے بارے میں میرے تبصرات یہ ہیں:

ایکسپرس ٹریبیون:

ان دو ہفتوں کے دوران ایکسپرس ٹریبیون کے بلاگز کے صفحے پر کوئی نئی بلاگ پوسٹ نہیں کی گئی۔ البتہ ایک بلاگ پوسٹ موجود تھی جس کا عنوان 'یقیناً سب سے پسندیدہ دوست: پاکستان بھارت سے پٹرول درآمد کرے گا' تھا۔ اس بلاگ پوسٹ میں بلوچستان کا تذکرہ صرف چار تبصروں میں کیا گیا تھا۔ پہلے تبصرے میں بلوچستان کو موجودہ حکومت کی سب سے بڑی ہار قرار دیا گیا، جبکہ دوسرے تبصرے میں ایران سے سمگل کیے جانے والے پٹرول کا ذکر تھا۔ تیسرے اور چوتھے تبصرے میں بالترتیب ٹارگٹ کلنگ اور صوبے میں تیل کی موجودگی کا ذکر کیا گیا تھا۔

پاکستان ٹوڈے:

ان دو ہفتوں کے دوران، پاکستان ٹوڈے بلاگ پر بھی کوئی نئی بلاگ پوسٹ نہیں تھی۔ البتہ ایک حالیہ پوسٹ، جس کا عنوان 'پی ٹی آئی کی کوئٹہ سونامی تبدیلی کا باعث ثابت ہوگی: قیوم' اس پوسٹ میں پی ٹی آئی کے کوئٹہ جلسے کے ذکر کے ساتھ ساتھ سابقہ وزیر، ملک عبدالقیوم کا تبصرہ بھی شامل کیا گیا تھا، جو کہ اب پی ٹی آئی کے ممبر بن چکے ہیں۔ البتہ اس بلاگ پوسٹ پر کسی قسم کے تبصرے موجود نہیں تھے۔

ان بلاگز پر بلوچستان کی کوریج سے پتا چلتا ہے کہ:
۔ دوسرے صوبوں کی نسبت بلوچستان کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔ ایک اخبار کی ویب سائٹ پر بلوچستان پر دو تین خبروں سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

ان ویب سائٹس پر جو بھی مواد موجود تھا، وہ صوبے کی بگڑتی ہوئی صورتحال، نواب اکبر بگٹی کے مقدمے کا دوبارہ کھلنا یا مری اور مینگل قبائل کے لیڈروں کے بارے میں تھا۔

صوبے کی سیاسی صورتحال کے علاوہ یہاں کی عام عوام، فنکاروں، تاجروں اور دیگر افراد کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا، جو کہ اب بھی اپنے آپ کو اس ملک کا اہم حصہ سمجھتے ہیں۔ ان بلاگز کے تفریحی حصوں میں دیگر صوبوں کے فنکاروں کا ذکر کیا گیا تھا، مگر بلوچستان کا ذکر کہیں نہیں تھا۔ یہاں کی ثقافت اور خوبصورتی کا ذکر کہیں نہیں تھا۔ یقیناً ہر کوئی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر اس یکطرفہ رپورٹنگ کی وجہ کیا ہے؟

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ صوبہ بلوچستان، تیل، سونے، کوئلے اور دیگر معدنیات کے ذخائر سے مالا مال ہے۔ یہ انتہائی شرمناک ہے کہ کسی بھی بلاگ پر بلوچستان کے اس پہلو کا تذکرہ نہیں کیا گیا تھا۔ آخر گوادر کی بندرگاہ کا ذکر کیوں نہیں کیا جاتا، جسے آنے والے وقتوں میں دنیا کی سب سے اہم بندرگاہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اس اہم ترین بندرگاہ کا ذکر بھی کہیں نہیں ملتا۔

اس یکطرفہ رپورٹنگ کی ایک بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ زیادہ تر اخباروں میں بلوچستان پر رپورٹنگ کرنیوالے صحافی حضرات کا تعلق اس صوبے سے نہیں ہے، اور وہ یہاں کے حالات سے واقفیت نہیں رکھتے۔ کسی علاقے پر خبر دینے کیلئے یقیناً ضروری ہے کہ صحافی وہاں کے حالات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ان صحافیوں کی معلومات کا واحد ذریعہ الیکٹرانک میڈیا اور اخبارات ہوتے ہیں، اسی لئے کئی بار زمینی حقائق کا ذکر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر کیا اس سے مراد یہ ہے کہ اس صوبے میں صحافیوں کی کمی واقع ہو رہی ہے؟

باوجود اس کے کہ بلوچستان میں 'بلوچ حال'، 'مہنامہ بلوچی' اور 'بلوچی دنیا' جیسے آن لائن میگزین موجود ہیں جو کہ مقامی صحافیوں کے ذریعے عوام کو وہاں کے حالات سے آگاہ کرتے رہتے ہیں، پھر بھی ہر درجہ کوشش کی جاتی ہے کہ ان آن لائن اشاعات کو بھی روکا جائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان میگزینوں کی ویب سائٹس کو اکثر اوقات بند کر دیا جاتا ہے۔ اس ساری کاروائی میں سرکاری حکام کا کردار نہایت اہم ہے۔ ایک تاثر یہ بھی ہے آنے والے وقت میں شاید یہ ویب سائٹس ہمیشہ کیلئے بند کر دی جائیں گی۔

اب ہم کچھ روشنی ریڈیو پر بلوچستان کی کوریج کے اوپر ڈالیں گے۔ خوش قسمتی سے یہ وہ واحد ذریعہ ابلاغ ہے جس پر بلوچستان کو اچھی کوریج دی جا رہی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک بلوچستان میں واحد ریڈیو اسٹیشن سرکاری ریڈیو اسٹیشن تھا۔ البتہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

۲۰۱۰ میں کئے گئے ایک سروے کے مطابق اس صوبے میں پانچ ریڈیو اسٹیشن موجود ہیں۔ ان میں تین نجی (ایف ایم ۹۱ گوادر، سچل ایف ایم ۱۰۵ اور چلتن ایف ایم ۸۸) اور دو سرکاری ریڈیو اسٹیشن ہیں۔ یہ نجی ریڈیو اسٹیشن بلوچی عوام کی تفریح کا باعث بنتے ہیں اور یہاں کی ثقافت کو مدنظر رکھتے ہوئے پروگرام تشکیل دیتے ہیں۔ البتہ انہیں بھی کبھی کبھی اپنی نشریات پر پابندی لگانا پڑتی ہے۔

دیگر صوبوں کے ریڈیو چینلز بھی بلوچستان پر خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ماسوائے پانچ منٹوں پر مبنی نیوز بلیٹن کے علاوہ بلوچستان کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ اور جس قدر ذکر کیا جاتا ہے اس میں منفی باتوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

اس مضمون کا مقصد ہرگز میڈیا پر تنقید کرنا نہیں ہے۔ اگر بلوچستان کو حکومت نے ہی درگزر کر دیا ہے تو پھر ہم میڈیا سے کیا بعید رکھ سکتے ہیں؟ بلوچستان یقیناً مشکل وقت سے گزر رہا ہے، تاہم یہاں کے صحافیوں کو چاہیے کہ انٹرنٹ پر رپورٹنگ کرتے وقت بھی یہاں کے مسائل کے ساتھ ساتھ یہاں کے دیگر پہلوؤں کا ذکر بھی کیا جائے۔

بلوچی عوام میں پاکستان مخالف جذبات کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں کے لوگ پاکستانی ہیں اور انہیں دیگر صوبوں کی عوام کی طرح ہی دیکھنا چاہیے۔ میڈیا شاید اس مسئلے کو ختم تو نا کر سکے، مگر یقیناً اس کی بہتری میں کردار ضرور ادا کر سکتا ہے۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

بلوچستان کے پریس کلبز کا ایک جائزہ

خرم سلیم

تحقیق: اویس محمود

اس مضمون کے ذریعیہم نے بلوچستان کے مختلف شہروں میں موجود پریس کلبز کے بارے میں جاننے کی کوشش کی ہے۔ یہ پریس کلب کب اور کیسے وجود میں آئے اور ان کے ممبران کی تعداد کیا ہے، وغیرہ وغیرہ؟ پریس کلبز کے وجود کا مقصد صحافیوں کو ایک ایسی جگہ فراہم کرنا ہوتا ہے جہاں وہ ایک دوسرے سے ملنے کے ساتھ ساتھ مختلف پیشہ ورانہ موضوعات پر بات چیت کرسکیں اور کسی اہم شخصیت کی آمد پر پریس بریفنگ کا انعقاد بھی کیا جا سکے۔ اسی بنا پر ہم نے یہ ضروری جانا کہ بلوچستان کے مختلف شہروں میں موجود پریس کلبز کی تعداد کا ایک جائزہ لیا جائے۔

ہمیں یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ بلوچستان کی ہر تحصیل میں پریس کلبز موجود ہیں، البتہ لورالائی میں پریس کلب کی کوئی عمارت نہیں ہے۔ بلوچستان میں حکومتی تعاون سے چلنے والے پریس کلب بھی ہیں، نجی طور پر چلنے والے پریس کلبز بھی ہیں اور اپنی مدد آپ کے تحت چلنے والے پریس کلبز بھی موجود ہیں۔ حکومتی تعاون سے چلنے والے پریس کلب وہ ہیں جو حکومتی احکام کے تحت وجود میں آئے، جبکہ نجی نوعیت کے پریس کلب وہ ہیں جو کسی فرد یا چند افراد پر مبنی ایک گروہ کے تعاون سے کام کر رہے ہوں۔ اپنی مدد آپ کے تحت چلنے والے پریس کلبز زیادہ تر گھروں یا کسی گیسٹ ہاؤس میں اپنی روزمرہ کے فرائض انجام دے رہے ہوتے ہیں۔

حکومتی تعاون سے چلنے والے پریس کلب کوئٹہ، دالبندین، پشین، سبی، زیارت، ہرنائی، ڈھاڈر، ڈوکی، مستونگ، ارمابیل، تربت، گوادر، ڈیرہ بگٹی، ڈیرہ مراد جمالی، ڈیرہ اللہ یار، استامحمد اور صحبت پور کے علاقوں میں ہیں۔ نجی طور پر چلنے والے پریس کلب موسیٰ خیل، کوہلو، جھل مگسی، قلات، وشوک اور شیرانی میں ہیں، جبکہ اپنی مدد آپ کے تحت چلنے والے پریس کلب چاغی، نوکنڈی اور تفتان میں موجود ہیں۔ ان پریس کلبز کے ممبران کی تعداد مختلف ہے۔ تفتان کے پریس کلب کے کل ۴ ممبران ہیں جبکہ ڈیرہ اللہ یار میں موجود پریس کلب کے ممبران کی تعداد ۳۴ ہے، جو سب سے زیادہ بھی ہے۔ اسی طرح پشین کے پریس کلب کے کل ۳۱ ممبران ہیں، ڈھاڈر کے ۶ اور ڈیرہ بگٹی میں موجود پریس کلب کے کل ۱۰ ممبران ہیں۔

بلوچستان میں موجود پریس کلبز کو ان کے وجود میں آنے کے ادوار کی بنیاد پر بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کچھ پریس کلب وہ ہیں جو ۸۰ کی دہائی میں وجود میں آئے، کچھ شہروں میں موجود پریس کلب ۹۰ کی دہائی میں بنے، جبکہ کچھ ۲۰۰۰ کی دہائی میں بنائے گئے۔

۸۰ کی دہائی میں وجود میں آنے والے پریس کلب مندرجہ ذیل ہیں:

۔ڈیرہ مراد جمالی کا پریس کلب ۱۹۸۲ میں وجود میں آیا

۔سبی کا پریس کلب ۱۹۸۷ میں قائم کیا گیا

۔۹۰ کی دہائی میں قائم ہونے والے پریس کلب مندرجہ ذیل ہیں:

۔مستونگ پریس کلب ۱۹۹۲ میں

۔جھل مگسی پریس کلب ۱۹۹۵ میں

۔گوادر پریس کلب ۱۹۹۵ میں

۔زیارت پریس کلب ۱۹۹۶ میں

۔ہرنائی پریس کلب ۱۹۹۷ میں

۔نوکنڈی پریس کلب ۱۹۹۷ میں

۔موسیٰ خیل پریس کلب ۱۹۹۸ میں

۔لورالائی پریس کلب ۱۹۹۸ میں

۲۰۰۰ کی پہلی دہائی میں قائم ہونے والے پریس کلب مندرجہ ذیل ہیں:

۔تربت پریس کلب ۲۰۰۰ میں

۔کوہلو پریس کلب ۲۰۰۱ میں

۔ڈوکی پریس کلب ۲۰۰۴ میں

۔چاغی پریس کلب ۲۰۰۴ سے ۲۰۰۵ کے درمیان

۔ارمابیل پریس کلب ۲۰۰۵ میں

۔سنجاوی پریس کلب ۲۰۰۶

۔ڈیرہ اللہ یار پریس کلب ۲۰۰۷

۔شیرانی پریس کلب ۲۰۰۷

۔ڈھاڈر پریس کلب ۲۰۰۹

۔دالبندین پریس کلب ۲۰۰۹ سے ۲۰۱۰ کے درمیان

۔واشوک پریس کلب ۲۰۱۰

کوئٹہ پریس کلب کی بنیاد ۱۹۷۰ میں رکھی گئی اور اب تک اسے ملنے والی مالی معاونت ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔اسی طرح بہت سی سیاسی شخصیات نے مختلف شہروں میں پریس کلبز کی بنیادیں رکھتے وقت مالی معاونت فراہم کی۔جیسا کہ امیر الملک مینگل، سابق گورنر بلوچستان اور سابق وزیراعظم ظفراللہ خان جمالی نے کوئٹہ پریس کلب کو مالی معاونت فراہم کی۔سابق وزراء جناب اسد بلوچ اور حاجی سرور خان کاکڑ نے پشین پریس کلب کو مالی معاونت فراہم کی۔جناب یحیی خان ناصر نے بھی پشین پریس کلب کو ۴ سائیکلوں اور ایک فیکس مشین کی صورت میں مالی معاونت فراہم کی۔جام یوسف جمالی نے موسی خیل، مولانا وصی اور ڈپٹی کمشنر اسفندیار کاکڑ نے مستونگ، بیگم غزالہ گولا نے صحبت پور اور ظہور خان کھوسہ نے ڈیرہ اللہ یار کے پریس کلبز کو مالی معاونت فراہم کی۔

ان میں سے زیادہ تر پریس کلب جنرل مشرف کے زمانہ حکومت میں بنائے گئے۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچستان کے زیادہ تر پریس کلبز ۲۰۰۰ کی دہائی کے شروع میں میڈیا کے پھیلاو کے دوران بنائے گئے۔البتہ ممبران کی کم تعداد اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان علاقوں میں ابھی بھی میڈیا کو قبول نہیں کیا گیا۔صحافیوں کی کم تعداد اور پریس کلبز کے کمزور ڈھانچے کے باوجود آنے والے وقت میں بلوچستان میں صحافت کی مضبوطی کی امید کی جاسکتی ہے۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

پول کے سوالات

تحقیق: سندس سیّدہ

۳۔کیا آپ کے خیال میں میڈیا بلوچستان کے مسائل کے حل کیلئے کوئی کردار ادا کر رہا ہے؟

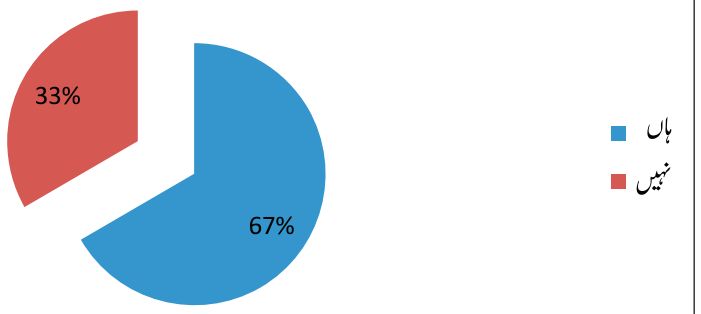

۴۔کیا بلوچستان صحافت کے حوالے سے دنیا کا سب سے خطرناک خطہ بن چکا ہے؟

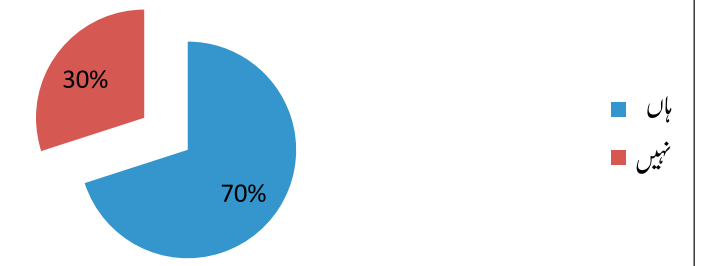

پول کے سوالات

۱۔کیا آپ کے خیال میں میڈیا بلوچستان کو کوریج فراہم کر رہا ہے؟

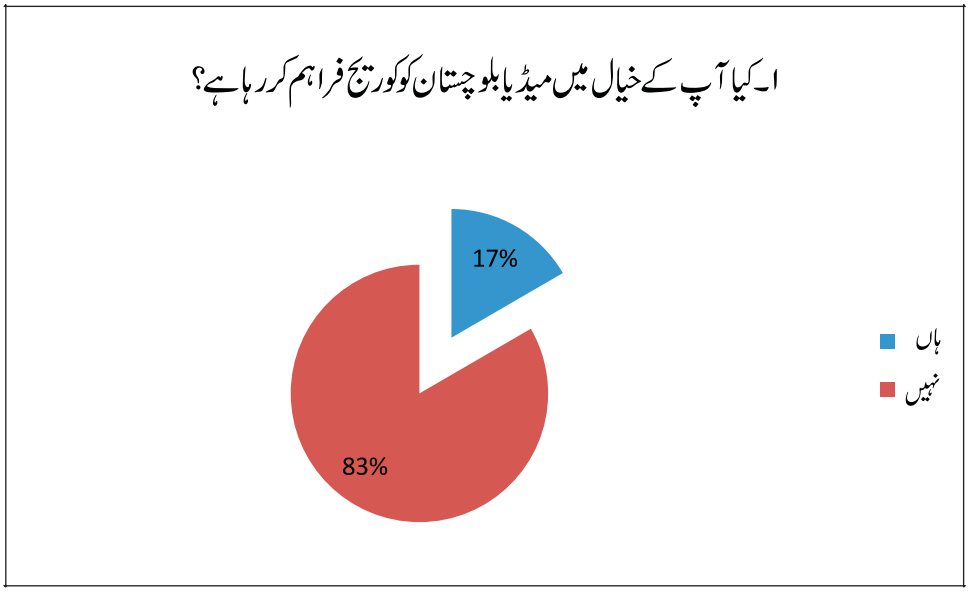

۲۔آپ کے خیال میں بلوچستان کے حوالے سے میڈیا کی توجہ کا مرکز کسے ہونا چاہیے؟

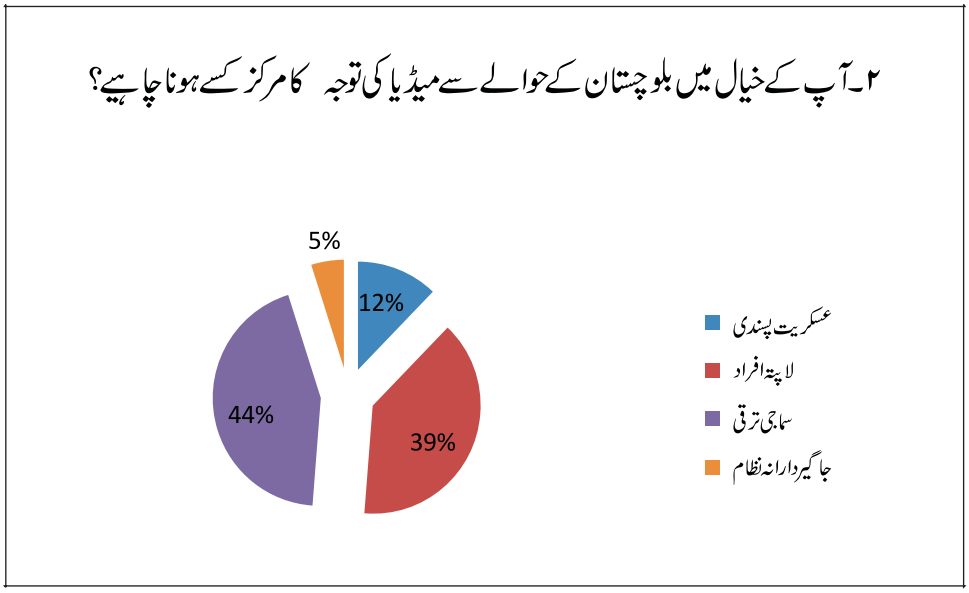

ڈاکومینٹریز

ادارے سے آگاہی

انڈ ویجوئل لینڈ پاکستان ایک متحرک، غیر جماعتی اور غیر منافع بخش رجسٹرڈ سول سوسائٹی ادارہ ہے۔اس کا بورڈ کل پانچ ارکان پر مشتمل ہے، جبکہ روزمرہ کے معاملات اس ادارے کے ڈائریکٹر کی ذمہ داری ہے۔ قیام سے لے کر آج تک اس ادارے نے حکومتی انتظامات، قانون کی بالادستی، میڈیا اور مراسلاتی، ہنر، سول سوسائٹی کے استحکام اور جمہوریت کی ترقی کے لئے کام کیا ہے۔

انڈ ویجوئل لینڈ نے واضح طور پر قانون دانوں اور دیگر سول سوسائٹی اداروں کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں کام کیا ہے اور خصوصاً میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کی تربیت کے حوالے سے اس کا نام پورے پاکستان میں جانا جاتا ہے۔

اشاعت

میڈیا سے متعلق

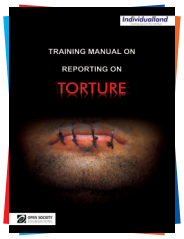

تنازعاتی تجزیے اور انتہا پسندی کے خاتمے سے متعلق

پاکستان پولیس خواتین

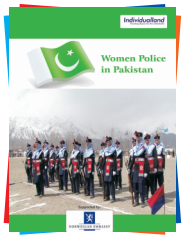

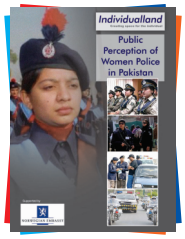

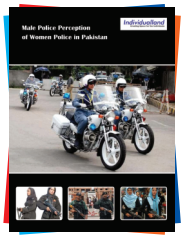

فرد میگزین

حکومت اور احتساب

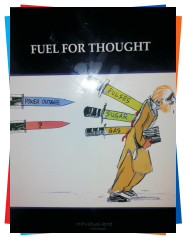

اقتصادیات

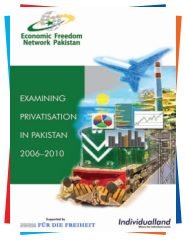

اگلی اشاعت اکتوبر ۲۰۱۲ میں

http://individualland.com/firm-blog/
info@individualland.com
www.individualland.com